مقالات شبلی

جلد اول

علامہ شبلی نعمانیؒ

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی پوسٹ باکس نمبر ۱۹ - اعظم گڈھ (ہند) ۲۷۶۰۰۱

مقالات شبلی

جلد اول (مذہبی)

مولانا شبلی نعمانی کے تمام مذہبی مضامین کا مجموعہ جن کو
مختلف رسالوں اور اخباروں سے یکجا کیا گیا ہے۔

دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند) ۲۷۶۰۰۱

سلسلہ دارالمصنفین نمبر ۳۸

کتاب : مقالات شبلی حصہ اول

مصنف : علامہ شبلی نعمانی

صفحات : ۲۲۶

جدید اڈیشن : ۱۹۹۹ء

مطبع : معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)

ناشر : دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)

قیمت :

باہتمام

عبدالمنان ہلالی

☆ ☆ ☆ ☆

فہرست مضامین

مقالات شبلی جلد اول (مذہبی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین و علی آلہ الطاہرین ۔

مولانا شبلی مرحوم نے مستقل تصنیفات کے علاوہ مختلف عنوانات پر سینکڑوں علمی و تاریخی و ادبی و سیاسی مضامین لکھے تھے جو ہنوز اخبارات و رسائل کے صفحات میں منتشر تھے، علم دوست احباب کا تقاضا تھا کہ ان پراگندہ موتیوں کو ایک سلک میں منسلک کردیا جائے، کہ وہ ہر شخص کو یکجا میسر آسکیں اور اہل علم ان سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں، اگرچہ مولانا مرحوم کے چند مضامین "رسائل شبلی" اور "مقالات شبلی" کے نام سے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو چکے تھے، لیکن یہ دونوں مجموعے ناتمام ہیں اور صرف چند تاریخی و علمی مضامین پر مشتمل ہیں، اس بنا پر یہ ارادہ کیا گیا کہ مختلف عنوانات کے تحت اس عنوان پر ان کے تمام مضامین ایک ایک مستقل جلد میں کر دیئے جائیں تاکہ ان کے مضامین جس جس موضوع پر ہوں وہ الگ الگ مرتب میں نظر آئیں، اس خیال کو پیش نظر رکھ کر ملک کے مختلف رسائل و اخبارات مثلاً معارف، علی گڑھ، دکن ریویو، انسٹیٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، الندوہ، مسلم گزٹ وغیرہ وغیرہ سے ان کے تمام مضامین استقصاء کے ساتھ نہایت تلاش و محنت سے جمع کئے گئے اور مختلف موضوع کے لحاظ سے الگ الگ ان کی تقسیم کی گئی اور ان کی اشاعت کا انتظام کیا گیا ۔

یہ تمام مضامین غالباً ۹ جلدوں میں سما سکیں، جن کے علیحدہ علیحدہ عنوانات حسب ذیل ہوں گے، مذہبی، تمدنی، علمی، ادبی، تنقیدی، تعلیمی، قومی، سیاسی، اور آخری جلد ان کے خطبات اور تقریروں کے مجموعہ پر مشتمل ہوگی۔

پیش نظر جلد اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، بقیہ جلدیں آئندہ بہ ترتیب شائع ہوتی رہیں گی۔

وما توفیقی الا باللہ۔

سید سلیمان ندوی

ناظم دار المصنفین

اعظم گڑھ

۲۶ / شعبان ۱۳۵۹ھ

تاریخ ترتیب قرآن

قرآن مجید کا نزول اور جمع و ترتیب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر جس قدر زیادہ ہوتی جاتی تھی، اسی قدر دنیوی تعلقات سے آپ کا جی ہٹتا جاتا تھا اور جستجوئے حق آپ کو بے تاب کئے دیتی تھی، یہاں تک کہ آپ آبادی چھوڑ کر پہاڑ اور صحرا میں پھرنے لگے۔ مکہ سے منا کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جس کو حرا کہتے ہیں، اس میں ایک غار تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معمول کر لیا کہ کئی کئی دن تک مسلسل اس میں رہتے اور مراقبہ و مجاہدہ کرتے۔ کھانا گھر سے منگوا کر ساتھ لاتے، جب ہو چکتا تو گھر کو واپس جاتے، دو تین دن وہاں ٹھہرتے اور پھر واپس آ جاتے۔ اسی طرح پورا ایک مہینہ گزر گیا (۱) اور اتفاق یہ کہ یہ رمضان کا مہینہ اور آپ کی عمر کا چالیسواں سال تھا۔ اخیر دفعہ آپ اسی غار میں تشریف رکھتے تھے کہ آپ کو فرشتہ نورانی نظر آیا، اس نے آپ سے کہا کہ "پڑھ"۔ آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ فرشتہ نے آپ کو زور سے بغل میں بھینچا، پھر چھوڑ کر کہا کہ "پڑھ"۔ آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ اسی طرح تین بار اتفاق ہوا۔ تیسری دفعہ کے بعد فرشتہ نے یہ آیتیں خود پڑھیں اور آپ سے پڑھنے کی فرمائش کی۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ (العلق ۹۶: ۱-۳)

خدا کے نام سے پڑھ جس نے خلقت پیدا کی، جس نے انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھ اور تیرا خدا بڑا کریم ہے۔

ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ خواب میں واقع ہوا، یعنی فرشتہ

---

(۱) صحیح بن اسحق [illegible] بحوالہ سیرۃ ابن اسحاق - مطبعہ القاہرہ [illegible]

کا آنا اور آپ کو دبانا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں دیکھا۔ [۱]

آپ اس واقعہ کے بعد گھر میں آئے۔ آپ کا دل دھڑک رہا تھا۔ حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ مجھ کو کچھ اڑھا دو۔ دیر کے بعد جب سکون ہوا تو آپ نے تمام واقعات حضرت خدیجہؓ سے بیان فرمائے اور کہا کہ مجھ کو ڈر ہے (دیکھئے کیا ہونا ہے) خدیجہؓ نے کہا آپ مطمئن رہئے، خدا ہرگز آپ کو خوار نہ کرے گا۔ آپ صلہ رحم کرتے ہیں، ناداروں کی خبر لیتے ہیں، مہمانوں کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی تھے۔ جاہلیت میں عیسائی ہوگئے تھے اور چونکہ عبرانی زبان جانتے تھے، عبرانی زبان میں انجیل کا ترجمہ کیا کرتے تھے۔ آپ نے ورقہ کے سامنے سب ماجرا بیان کیا، ورقہ نے کہا یہ وہی ناموس (رازدار) ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا، کاش میں جوان ہوتا کہ جب قوم آپ کو نکالنا چاہتی تو میں آپ کے کام آسکتا۔ آپ نے پوچھا کیا یہ بھی ہوگا، ورقہ نے کہا ہمیشہ ایسی حالتوں میں لوگ دشمن بن جاتے ہیں۔ [۲]

اس کے بعد تین برس تک آپ پر کوئی وحی نہیں آئی (۳) ایک دن آپ نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی آنکھ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ جو حرا میں نظر آیا تھا، آسمان اور زمین کے بیچ میں ایک کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا۔ آپ پر رعب طاری ہوا۔ اسی حالت میں گھر واپس آئے اور فرمایا کہ مجھ کو کچھ اڑھا دو، اس وقت یہ آیتیں آپ پر

---

(۱) صحیح بخاری مطبوعہ نسخہ جلد ۱ ص ۲، سطر ۳ (۲) یہ پوری تفصیل قریباً حرف بہ حرف بخاری کے پہلے ہی صفحہ میں ہے، محدثانہ طریقہ سے اس حدیث میں لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ حضرت عائشہؓ اس وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں نہیں آئی تھیں، بلکہ پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں، اس لئے یہ حدیث کسی اور سے سنی ہوگی، لیکن انہوں نے راوی کا نام نہیں بتایا۔ اس قسم کی حدیث کو محدثین کی اصطلاح میں مرسل کہتے ہیں۔ لیکن محدثین کا یہ مذہب ہے کہ صحابی جب کوئی حدیث بے سند بیان کرتا ہے تو وہ معتبر ہوتی ہے کیونکہ اس نے ضرور کسی صحابی سے سنی ہوگی اور صحابہ سب ثقہ ہیں۔ (۳) صحیح بخاری ص ۲، فتح الباری، ابن اسحاق و تاریخ احمد بن حنبل

نازل ہوئیں :-

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنذِرْ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۔ (المدثر ۷۴: ۱-۵)

اے کپڑوں میں لپٹے ہوئے اٹھ لوگوں کو ڈرا، خدا کی بڑائی کر کپڑے پاک کر اور ناپاکی سے الگ ہو جا۔

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا، وحی کا نزول اکثر تو کسی خاص واقعہ اور ضرورت کے پیش آنے پر ہوتا تھا اور کبھی یوں بھی ہوتا تھا اکثر تین تین چار چار آیتیں ایک ساتھ اترتی تھیں، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ دس دس آیتیں ایک ساتھ اتریں[۱]، جب کوئی آیت اترتی تھی تو آپ کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلوا کر وہ آیت لکھوا دیتے تھے [۲] اس زمانہ میں جن چیزوں سے کاغذ کا کام لیا جاتا تھا، حسب ذیل تھیں۔

عسیب : کھجور کی شاخ جس سے پتے کو الگ کر لیتے تھے۔

لخف : پتھر کی پتلی تختیاں۔

کتف : اونٹ یا بکری کی چوڑی ہڈیاں۔

ادیم : چمڑا۔

قتب : پالان کی لکڑی۔

چنانچہ کاغذ کے علاوہ ان تمام چیزوں پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا۔

قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق جو روایتیں منقول ہیں، ان سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ تک قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں میں کوئی ترتیب نہ تھی، موجودہ ذیل سے اس شبہ کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ صحیح روایتوں میں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں جب قرآن جمع کیا جانے لگا تو کھجور کے تختوں، ٹھیکروں اور ہڈیوں پر قرآن کی جو آیتیں لکھی ہوئی ملتی تھیں، ان کو جمع کرتے تھے اور ان سے نقل لیتے تھے، اگر سورتیں مرتب ہو چکی ہوتیں

(۱) اتقان نوع سادس عشر ج ۱ ص ۴۸ و ما بعد مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۲ء (۲) اتقان نوع ۱۸ ص ۱۳۰ و ما بعد بحوالہ ترمذی و نسائی وغیرہ۔

تو اس ردو قدح کی کیا ضرورت تھی۔

ترمذی اور نسائی وغیرہ میں روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے سورہ براءۃ کو انفال کے بعد کیوں رکھا اور دونوں میں بسم اللہ کے ذریعہ سے حد فاصل کیوں نہیں قائم کی؟ حضرت عثمانؓ نے کہا۔ سورہ انفال مدینہ میں سب سے پہلے اتری تھی اور سورہ براءۃ سب سے اخیر سورہ ہے، لیکن دونوں کے واقعات ملتے جلتے ہیں، اس لئے میں سمجھا کہ دونوں ایک ہی سورہ ہیں، لیکن چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں فرمائی تھی، اس لئے میں نے دونوں کو پاس پاس لکھا اور بیچ میں بسم اللہ نہیں لکھی۔

اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہے کہ سورہ براءۃ اور سورہ انفال کا الگ الگ مستقل سورہ ہونا مشتبہ اور مشکوک ہے۔

ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ حارث بن خزیمہ نے دو آیتیں پیش کیں کہ میں نے ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سنا تھا۔ حضرت عمرؓ نے تصدیق کی اور کہا کہ اگر تین آیتیں ہوتیں تو ایک مستقل سورہ ہو جاتی، اس لئے اب یہ کرنا چاہئے کہ جو سورہ سب سے اخیر میں اتری ہو اس کے اخیر میں یہ آیتیں شامل کر دی جائیں (۱) اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک سورتیں مرتب نہیں ہو چکی تھیں۔

چونکہ یہ ایک معرکۃ الآراء بحث ہے اس لئے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کو لکھنا چاہتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی سورہ نازل ہونی شروع ہوتی تھی تو دو دو چار چار آیتیں موقع بہ موقع اترتی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کو اسی سورہ میں داخل کراتے جاتے تھے، جب ایک سورہ ختم ہو جاتی تو علیحدہ نام سے موسوم ہو جاتی تھی اور دوسری سورہ شروع ہوتی تھی، کبھی ایک ساتھ دو سورتیں نازل ہونی شروع ہوتیں

(۱) اتقان ذکر جمع و ترتیب قرآن ج ۱ ص ۶۰

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دونوں سورتوں کو الگ الگ لکھواتے جاتے، اس طرح سے آپ کے زمانہ ہی میں سورتیں مدون ہو چکی تھیں، لیکن باہم سورتوں میں کوئی ترتیب نہ تھی، یہی کام تھا جو حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں انجام پایا، یہ امر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورتیں مرتب ہو چکی تھیں اور ان کے نام قرار پا چکے تھے عموماً حدیثوں سے ثابت ہے، حذیفہ کی حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں بقرہ، آل عمران اور نساء پڑھی، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز میں سورہ اعراف پڑھی، اسی طرح اور حدیثوں میں یہ تصریح آیا ہے کہ فلاں فلاں سورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں پڑھتے تھے۔

یہ امر بھی قطعی ہے کہ قرآن مجید کا بڑا حصہ ایک مجموعہ کی شکل میں مدون ہو چکا تھا، حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ قرآن مجید تین مرتبہ مدون کیا گیا اور سب سے پہلی تدوین خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی، حاکم نے زید بن ثابت سے ایک حدیث نقل کی ہے جس کی سند بخاری اور مسلم کی شرط کے موافق ہے اور جس کے الفاظ یہ ہیں۔

کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نؤلف القرآن من الرقاع (۱)

یعنی ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس قرآن مجید کو پرزوں اور ٹکڑوں سے لے کر جمع کرتے تھے۔

یہی مجموعہ ہے جس کی نسبت قرآن مجید میں جا بجا صحیفہ، کتاب اور رق کا لفظ آیا ہے۔

رَسُولٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینہ ۹۸ : ۲)

خدا کا پیغمبر جو پاک صحیفے پڑھتا ہے جن میں معقول احکام ہیں۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ (الطور ۵۲ : ۳)

اور قسم ہے اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ پر لکھی ہوئی ہے۔

---

(۱) اتقان ج ۱ ص ۶۰ (۲) رق چمڑے کو کہتے ہیں، جس کو قدیم زمانہ میں کاغذ کے طور پر (بقیہ ص ۶ پر)

ہیں، وہ انبیاء کو زبانی وحی پہنچاتے ہیں، لوح محفوظ کے اوراق لے کر نہیں آتے۔

غرض یہ ہے اور صاف معنی یہی ہیں کہ قرآن مجید صحیفوں میں لکھا ہوا ہے اور یہ صحیفے برگزیدہ اور پاک لوگوں یعنی صحابہ کے ہاتھوں میں ہیں۔ تفسیر کبیر میں ہے:

والسفرۃ الکرام البررۃ ھم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقیل ھم القراء (۱)	سفرائے کرام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ہیں اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ حافظ قرآن مراد ہیں۔

خوش اعتقادی کی وجہ سے اگرچہ عام لوگوں کا ذہن، لوح محفوظ کی طرف جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ کہ آیتوں کے سیاق و سباق سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحیفے سے یہی قرآن مجید مراد ہے، حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں۔ (۲)

وقد اعلم اللہ تعالی فی القرآن بانہ مجموع فی الصحف فی قولہ یتلوا صحفا مطہرۃ الایۃ وکان القرآن مکتوبا فی الصحف لکن کانت مفرقۃ فجمعہا ابو بکر خدا نے قرآن مجید میں بتا دیا کہ قرآن صحیفوں میں مجتمع ہے (یعنی اس آیت میں یتلوا صحفا الخ) اور قرآن صحیفوں میں لکھا ہوا موجود تھا، لیکن یکجا نہ تھا، حضرت ابوبکر نے یکجا کر دیا۔ (۳)

خدا نے جا بجا قرآن مجید کے مدون اور محفوظ رہنے کو اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۞ (الحجر: ۹)	ہم نے قرآن کو اتارا ہے اور ہم اس کی حفاظت کریں گے۔
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۞ (القیامۃ: ۱۷)	ہم پر ہے قرآن کا جمع کرنا اور اس کا پڑھ کر سنانا۔

یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کی حفاظت اور تدوین کا ذکر ہے، وہ لوح محفوظ نہیں بلکہ وہ قرآن ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے قید کتابت میں

(۱) تفسیر کبیر ج ۱ ص ۲۰ (۲) فتح الباری ج ۹ ص ۱۰ (۳) ایضاً

آیا تھا اور کاغذ وغیرہ پر لکھا گیا تھا۔

خدا نے جب قرآن مجید کی حفاظت اور تدوین کا اہتمام سے ذکر کیا تو حفاظت اور تدوین کے اسباب ظاہری بھی ذکر کئے۔ یعنی یہ کہ وہ محفوظ اوراق میں ہے، ہر کس و ناکس اس کو چھونے نہیں پاتا۔ جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے وہ معزز اور مقدس لوگ ہیں۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَكْنُونٍ (۱) لَا يَمَسُّهُ إِلَّا الْمُطَهَّرُونَ۔ (واقعہ ۷۷، ۷۸، ۷۹)

وہ بزرگ قرآن ہے، محفوظ کتاب میں ہے اس کو صرف پاک لوگ چھونے پاتے ہیں۔

فِي صُحُفٍ مُكَرَّمَةٍ مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ (عبس ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶)

وہ ایسے اوراق میں لکھا ہوا ہے جو بلند پایہ ہیں، پاک ہیں، لکھنے والے بزرگ کے ہاتھ میں ہیں۔

آیات مذکورہ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ:

۱۔ قرآن مجید کے اجزاء آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قلم بند کئے گئے تھے۔

۲۔ یہ اجزاء چمڑے یا اور کسی قسم کے کاغذ پر لکھے گئے تھے۔

۳۔ ان کی حفاظت کا خاص اہتمام تھا اور بغیر طہارت کے لوگ ان کو ہاتھ نہیں لگانے پاتے تھے۔

بایں ہمہ یہ نہیں ہوا کہ یہ اجزاء اس طرح مرتب ہوگئے تھے کہ ایک آیت بھی چھوٹنے نہ پائی ہو۔ چونکہ وحی کا سلسلہ وفات تک جاری رہا اور یہ اجزاء ہر وقت ساتھ نہیں رہتے تھے۔ اس لئے یہ بھی ہوا کہ بعض آیتیں جو اتریں وہ کسی پرچہ یا ہڈی وغیرہ پر لکھ لی گئیں اور اس مجموعہ میں نہ شامل ہو سکیں۔ الگ کسی پرچہ یا ہڈی وغیرہ پر لکھی رہ گئیں۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ میں ایک ایک پرزہ اور ہڈی وغیرہ جو جمع کیں استقصا اور احتیاط کی غرض سے کیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن مجید اس وقت

(۱) مکنون کے معنی تمام مفسرین نے محفوظ کے کئے ہیں۔

تک صرف انھیں پرزوں پر تحریر تھا۔ حارث محاسبی لکھتے ہیں۔

كتابة القرآن ليست بمحدثة فانه صلى الله عليه وسلم كان يأمر بكتابته ولكنه كان مفرقا في الرقاع والاكتاف والعسب فانما امر الصديق بنسخها من مكان الى مكان مجتمعا۔ (۱)

قرآن مجید کی کتابت کوئی نئی بات نہ تھی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے قلم بند کرنے کا حکم دیا تھا۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مختلف چیزوں یعنی کاغذ، شانہ کی ہڈی، کھجور کے تختہ پر لکھا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے حکم دے کر سب ایک جا جمع کر دیا جائے۔

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جس حد تک تدوین ہو چکی تھی اسی قدر تھی۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عمرؓ کی تحریک سے قرآن کے تمام اجزاء یکجا کروائے۔ جس کی تفصیلی کیفیت حسب ذیل ہے۔

سنہ نبوت میں جو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا پہلا سال تھا۔ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ یمامہ کی لڑائی میں اکثر حفاظ قرآن شہید ہوئے اگر اور لڑائیوں میں اسی طرح حفاظ شہید ہوتے تو قرآن کا بہت سا حصہ جاتا رہے گا (۲) حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں وہ کام کیونکر کروں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا لیکن یہ اچھا کام ہے۔ غرض حضرت عمرؓ کے بار بار کہنے سے حضرت ابوبکرؓ کے ذہن میں بھی اس کی مصلحت آ گئی۔ انھوں نے زید ابن ثابتؓ کو جو کاتب وحی تھے، بلا کر اس کام پر مامور کیا۔ انھوں نے بھی پہلے عذر کیا۔

(۱) اتقان نوع ۱۸ ج ۱ ص ۶۰ (۲) بخاری باب جمع القرآن ج ۲ ص ۷۴۵ بعض کی روایت میں یہی لفظ ہے لیکن یہ امر تمام محدثین اور مؤرخین کے نزدیک مسلم ہے کہ قرآن مجید کل کا کل قلم بند ہو چکا تھا۔ بعض روایتیں اس کے خلاف ہیں تو ان میں صرف دو آیتوں کا ذکر ہے کہ وہ لکھے سے رہ گئی تھیں اور بعض صحابہ کو زبانی یاد تھیں۔ اس لئے اگر تمام حفاظ قرآن شہید ہو جاتے جب بھی اس کی کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن مجید کا بڑا حصہ ضائع ہو جاتا۔

لیکن بالآخر وہ بھی متفق ہو گئے اور جہاں جہاں قرآن مجید کسی چیز پر لکھا ملتا تھا۔ سب کو یکجا کرنا شروع کیا۔

اختلاف مصاحف اور قرأت

حضرت عثمانؓ نے جس طرح قرآن مجید کو ترتیب دیا۔ بعض صحابہ نے اس کے خلاف ترتیب دی تھی اور وہ اپنی اسی ترتیب پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ جب حضرت عثمانؓ کا حکم پہنچا کہ ان کی ترتیب کے خلاف جو نسخے پائے جائیں ضائع کر دیئے جائیں تو ان لوگوں نے اس حکم کی اطاعت نہیں کی اور بڑے استقلال سے ان کے حکم کو روکا۔ ان مصاحف کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مصحف عبداللہ بن مسعودؓ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ان چار صحابہ میں ہیں جن کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ لوگ ان سے قرآن مجید سیکھیں۔ انھوں نے اپنے اجتہاد کے موافق سورتوں کی ترتیب کی تھی۔ جو حضرت عثمانؓ کی ترتیب کے مخالف تھی۔ فتح الباری شرح بخاری میں ہے۔ وان فیہ دلالۃ علی ان تالیف مصحف ابن مسعود علی غیر تالیف العثمانی۔ (۱)

نسائی اور ابوداؤد میں روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے منبر پر چڑھ کر کہا۔ تم لوگ مجھ کو کیوں کر حکم دیتے ہو کہ میں زید بن ثابتؓ کی قرأت کے موافق قرآن پڑھوں۔ میں نے تو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سیکھا ہے۔ (۲)

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس کی ترتیب بھی ترتیب نزول کے موافق نہ تھی (۳)۔ ابن الندیم نے اس کی ترتیب حسب ذیل بیان کی ہے۔

بقرہ۔ نساء۔ آل عمران۔ المص۔ انعام۔ مائدہ۔ یونس۔ براۃ۔ نحل۔ ہود۔ یوسف۔ بنی اسرائیل۔ انبیاء۔ مومنون۔ شعراء۔ صافات۔ احزاب۔ قصص۔ نور۔ انفال۔ مریم۔ عنکبوت۔ روم۔ الخ (کتاب الفہرست میں اخیر تک کی تمام سورتیں لکھ دی ہیں)

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے ابن مسعود کے متعدد قرآن دیکھے۔ لیکن

---

(۱) ج ۹ ص ۳۰ مطبعۃ الکبری بولاق مصر ۱۳۰۱ھ (۲) ایضاً ص ۴۴ (۳) ایضاً

ان میں دو بھی باہم متفق نہ تھے۔ (۱)

مصحف علی۔ یہ مصحف حضرت علیؓ نے ترتیب دیا تھا اور اس میں نزول کی ترتیب ملحوظ رکھی تھی یعنی جو آیتیں اور سورتیں جس ترتیب سے اتری تھیں وہی ترتیب قائم رکھی تھی۔ حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں۔

و یقال ان مصحف علی کان علی ترتیب النزول اوله اقرء ثم المدثر ثم ن والقلم، ثم المزمل، ثم تبت، ثم التکویر، ثم سبح وھکذا الی اخر المکی ثم المدنی۔ (۲)

ابن الندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں کہ میں نے ابو یعلی حمزۃ الحسنی کے پاس ایک قرآن دیکھا تھا جو ان کے خاندان میں متوارث چلا آتا تھا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا (۳) ابن الندیم کا زمانہ چوتھی صدی ہے، اس لئے اس زمانہ تک اس نسخہ کا موجود ہونا ثابت ہے۔

مصحف ابی بن کعبؓ۔ اس مصحف کا ذکر بھی حافظ ابن حجر اور سیوطی نے جابجا کیا ہے۔ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں لکھا ہے کہ بصرہ سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا، جس کو قریۃ الانصار کہتے تھے، ابی بن کعبؓ نے یہیں بیٹھ کر قرآن کی ترتیب کی تھی۔ اس کے بعد ابن الندیم نے تمام سورتوں کا نام ان کی ترتیب کے موافق لکھا ہے اور لکھا ہے کہ ان کے قرآن میں کل آیتیں ۶۲۱۰ ہیں۔ (۴)

مصحف عائشہؓ۔ صحیح بخاری باب تالیف القرآن میں ہے کہ عراق سے ایک شخص حضرت عائشہؓ کے پاس آیا اور کہا کہ ام المومنین! آپ اپنا قرآن لائیے تو میں اپنا نسخہ درست کرلوں، کیونکہ لوگ قرآن کو بے ترتیب پڑھتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے کہا کسی سورہ کے پہلے پیچھے پڑھنے میں کیا حرج ہے (یعنی سورتوں میں کوئی خاص ترتیب ضروری نہیں)۔

(۱) کتاب الفہرست ص ۲۹ مطبوعہ الرحمانیہ مصر ۱۳۴۸ھ (۲) فتح الباری ج ۹ ص ۳۸
(۳) کتاب الفہرست ص ۴۲ (۴) ایضاً ص ۴۰

اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اپنا نسخہ نکالا اور عراق نے اس کے موافق مصاحف درست کرلیں [۱] ممکن ہے یہ وہی قرآن ہو جو حضرت ابوبکرؓ نے مرتب کرایا تھا۔

مصاحف کے اس اختلاف اور بعض غیر مستند روایتوں سے جو بڑی بڑی کتابوں میں مذکور ہیں، لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ قرآن مجید بھی توریت اور انجیل کی طرح بہت کچھ ادل بدل گیا ہے، ان شبہ کرنے والوں کے دلائل یہ ہیں:

۱۔ حضرت ابوبکرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابیؓ وغیرہ کے مصاحف میں جو اختلاف تھا وہ صرف ترتیب سور کی بنا پر نہیں ہوسکتا تھا، سورتوں کی ترتیب کوئی اہم امر نہ تھا، جس کی بنا پر عبداللہ بن مسعودؓ اس قدر جان بازی پر آمادہ ہو جاتے۔

۲۔ تمام اہل روایت متفقاً لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن میں دو سورتیں (معوذتین) نہ تھیں۔

حافظ ابن حجر شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

قد صح عن ابن مسعود انکار ذلک فاخرج احمد و ابن حبان عنہ انہ کان لا یکتب المعوذتین فی مصحفہ۔

احمد بزار طبرانی وغیرہ محدثین نے بسند صحیح روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ جس قرآن میں یہ دونوں سورتیں پاتے تھے مٹا دیتے تھے۔ [۲]

۳۔ طبری اور بیہقی نے بعض ایسی سورتیں روایت کی ہیں جو موجودہ قرآن میں مطلق نہیں ہیں، مثلاً:

اللھم انا نستعینک و نستغفرک و نثنی علیک و لا نکفرک و نخلع و نترک من یفجرک اللھم ایاک نعبد و لک نصلی و نسجد و الیک نسعی و نحفد نرجو رحمتک و نخشی نقمتک ان عذابک بالکافرین ملحق۔ [۳]

---

[۱] صحیح بخاری باب تالیف القرآن ج ۲ ص ۷۴۶ مطبع مجتبائی دہلی [۲] تفسیر اتقان سیوطی نوع ۲۰ ج ۱ ص ۸۶ [۳] اتقان سیوطی نوع ۱۹ ج ۱ ص ۸۵ مطبوعہ مصر مطبع ازہریہ مصر ۱۳۱۸ھ

۳۔ شیعہ جو مسلمانوں میں ایک گروہ اعظم ہے، اس بات کا قائل ہے کہ قرآن میں بہت کچھ حذف و اضافہ ہوا ہے۔

۴۔ قراتوں کے اختلافات جو منقول ہیں، ان میں ایسے اختلافات ہیں جو معمولی اختلاف نہیں بلکہ لفظ کے لفظ اور بعض جگہ جملے کے جملے بدل گئے ہیں۔

ان واقعات نے عیسائیوں کو موقع دیا کہ وہ تحریف انجیل کی مذمت اس الزامی جواب سے مٹائیں۔

سب سے پہلے ہم کو شیعوں کے الزام کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی حالت اور ان کی روایت قرآن مجید کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ شیعہ وہ فرقہ ہے جو خلفائے ثلاثہ کو سرے سے (نعوذ باللہ) کافر سمجھتا ہے اور جن لوگوں کے ہاتھ سے جو کام انجام پایا ہو، اس پر کبھی اعتبار نہیں کر سکتے۔ یہ مسلم ہے کہ جامع قرآن حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ اور اس کو بزور حکومت شائع کرنے والے حضرت عثمانؓ تھے۔ یہ بھی مسلم ہے کہ حضرت علیؓ نے قرآن مجید مرتب کیا تھا جس کی ترتیب بالکل مختلف تھی۔ خود سنیوں میں سے طبرانی اور بیہقی وغیرہ محدثین نے یہ روایتیں نقل کیں، (جیسا کہ ابھی اوپر نقل ہو چکیں) کہ بعض سورتیں قرآن مجید سے نکل گئیں اور بعض سورتوں کی بہت سی آیتیں جاتی رہیں۔ با ایں ہمہ شیعوں نے کیا کہا؟

علامہ طبرسی جو مشہور اور مستند شیعی مفسر ہیں، تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں۔

ومن ذلک الکلام فی زیادۃ القرآن ونقصانہ فانہ لا یلیق بالتفسیر فاما الزیادۃ فمجمع علی بطلانہ واما النقصان منہ فقد روی جماعۃ من اصحابنا وقوم من حشویۃ العامۃ ان فی القرآن تغییرا و

انھیں میں سے ایک بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں حذف یا اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ یہ بحث فن تفسیر سے متعلق نہیں۔ یہ امر کہ قرآن میں کچھ اضافہ ہو گیا ہے، سب کے نزدیک باطل ہے۔ باقی نقصان تو ہمارے فرقہ میں سے ایک گروہ نے اور سنیوں میں حشویہ [1] نے

(۱) حشویہ سے یہ لوگ کم درجہ کے محدثین کو مراد لیتے ہیں۔

نقصانا والصحیح من مذهب اصحابنا خلافه وهو الذی نصره المرتضی قدس الله روحه واستوفی الکلام فیه غایة الاستیفاء فی جواب المسائل الطبرسیات وذکر فی مواضع ان العلم بصحة نقل القرآن کالعلم بالبلدان والحوادث الکبار والوقائع العظام والکتب المشهورة واشعار العرب المسطورة فان العنایة اشتدت والدواعی توفرت علی نقله وحراسته وبلغت الی حد لم یبلغه فیما ذکرناه لان القرآن معجزة النبوة وماخذ العلوم الشرعیة والاحکام الدینیة وعلماء المسلمین قد بلغوا فی حفظه وحمایته الغایة حتی عرفوا کل شئ اختلف فیه من اعرابه وقراءته وحروفه وآیاته فکیف یجوز ان یکون مغیرا او منتقصا مع العنایة الصادقة والضبط الشدید ... وقال ایضا ان القرآن کان

روایت کی ہے کہ قرآن میں تغیر اور نقصان ہو گیا ہے لیکن ہمارے فرقہ کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے اور سید مرتضیٰ نے اس کی تائید کی ہے اور مسائل طبرسیات کے جواب میں اس پر نہایت مفصل بحث کی ہے۔ سید مرتضیٰ نے متعدد موقعوں پر لکھا ہے کہ قرآن کے صحت کا علم ایسا ہی ہے جیسا شہروں کا علم اور بڑے بڑے واقعات اور مشہور کتابوں اور عرب کے مدون اشعار کا علم، کیونکہ قرآن کی نقل اور حفاظت کے اسباب نہایت کثرت سے تھے اور اس حد تک پہنچے تھے کہ اور کسی چیز کے نہیں پہنچے، اس لئے کہ قرآن نبوت کا معجزہ اور علوم شرعیہ اور احکام دینیہ کا ماخذ ہے اور علمائے اسلام نے اس کی حفاظت اور حمایت میں انتہا درجہ کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ قرآن کے اعراب، قراءت، حروف، آیات کے اختلافات تک انہوں نے محفوظ رکھے، اس لئے کیونکر قیاس ہو سکتا ہے کہ اس احتیاط شدید کے ہوتے اس میں نقصان یا تغیر آنے پائے۔ سید مرتضیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا ہی مکتوب اور مرتب تھا جیسا اب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن اس زمانہ میں پڑھا جاتا تھا اور لوگ اس کو حفظ کرتے

على عهد رسول الله مجموعا مؤلفا على ما هو عليه الآن واستدل على ذلك بان القرآن كان يدرس و يحفظ جميعه في ذلك الزمان حتى عين على جماعة من الصحابة في حفظهم له و انه كان يعرض على النبي و يتلى عليه و ان جماعة من الصحابة مثل عبد الله بن مسعود و ابي بن كعب و غيرهما ختموا القرآن على النبي عدة ختمات وكل ذلك يدل بادنى تأمل على انه كان مجموعا مرتبا غير مبتور و لا مبثوث و ذكر ان من خالف في ذلك الامامية و الحشوية لا يعتد بخلافهم فان الخلاف في ذلك مضاف الى قوم من اصحاب الحديث نقلوا اخبارا ضعيفة (۱)

تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو سناتے تھے اور متعدد صحابہ مثلاً عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ وغیرہ نے قرآن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چند بار ختم کیا تھا۔ سید مرتضیٰ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو امامیہ یا حشویہ اس کے مخالف ہیں ان کی مخالفت قابل اعتبار نہیں، کیونکہ ان میں جن لوگوں نے خلاف کیا ہے وہ اہل حدیث میں سے ایک گروہ ہے اور انھوں نے ضعیف روایتیں نقل کی ہیں۔

طبرانی اور بیہقی وغیرہ نے جو روایتیں نقل کی ہیں، جن میں دعائے قنوت کو قرآن کی سورتوں میں داخل کیا ہے سرتاپا خرافات اور لغو ہیں۔ حیرت ہے کہ ایسے معزز محدثین اس قسم کی جھوٹی حدیثیں کیوں کر اپنی کتابوں میں نقل کرتے تھے اور جلال الدین سیوطی تو حاطب اللیل ہیں ہی، ان کو کسی قسم کی روایت سے کیا دریغ ہے۔

طبرانی کی روایت میں یہ راوی ہیں، عباد بن یعقوب الاسدی، یحییٰ بن یعلی اسلمی، ابن لہیعہ، الاجلح، عبداللہ بن زریر الغافقی۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ عباد بن یعقوب گو رواۃ بخاری میں ہیں لیکن جیسا کہ میزان الاعتدال ذہبی میں ہے "غالی شیعہ"

(۱) تفسیر مجمع البیان طبع ایران ج ۱ ص ۵

اور روافض بدعت - سے ہیں اور یہ اصول حدیث میں طے ہو چکا ہے کہ بدمذہب شخص جب کوئی ایسی روایت کرے جس سے اس کے مذہب کو تقویت پہنچتی ہو تو نامعتبر ہوگی، یہ ظاہر ہے کہ اس روایت سے ان غالی شیعوں کے دعویٰ کی تائید ہوتی ہے جو قرآن میں حذف و اضافہ کے قائل ہیں، یحییٰ بن اسلمی، مضطرب الحدیث ہیں اور حاتم نے ان کو ضعیف کہا ہے (۱) ابن سعید بھی ضعیف الحدیث ہیں۔

بیہقی کی روایت میں عبد الملک بن جریج ہیں، ان کو ذہبی نے اگرچہ نامور ثقات میں لکھا ہے، لیکن ساتھ ہی لکھا ہے کہ مدلس تھے - اور مدلس کی روایت عن عنہ کے ذریعہ سے ناقابل اعتبار ہوتی ہے، ذہبی کی تصریح سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت بھی شیعہ تھے، کیونکہ آپ نے ۹۰ عورتوں سے متعہ کیا تھا، (۲) امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ ابن جریج نے جو مرسل روایتیں کی ہیں ان میں بعض محض جعلی ہیں، بیہقی کے دوسرے راوی حمید بن مہیر ہیں اور ان کو میزان الاعتدال میں مجہول لکھا ہے - (۳) اسی طرح مستدرک وغیرہ کی یہ روایتیں کہ سورہ براۃ پہلے سورہ بقرہ کے برابر تھی، سب جھوٹ اور افتراء ہیں، مستدرک کے مصنف نیم شیعہ تھے، اس لئے اس قسم کی روایتوں میں ان کو مزہ آتا ہوگا - علامہ ذہبی ان کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں،

یصحح فی مستدرکہ احادیث ساقطة ویکثر من ذلک ... ثم هو شیعی مشهور یعنی وہ اکثر ساقط الاعتبار حدیثیں نقل کرتے ہیں اور مشہور شیعی ہیں۔ (۴)

عبداللہ بن مسعودؓ کا معوذتین سے انکار کرنا اگرچہ شہرت پکڑ گیا ہے اور حافظ ابن حجر کو روایت پرستی کی بنا پر اس کی صحت پر اصرار ہے، لیکن اور تمام محققین اس کو افترائے محض سمجھتے ہیں، امام نووی نے شرح مہذب میں لکھا ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ کی طرف اس قول کی نسبت صحیح نہیں، علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ عبداللہ ابن مسعودؓ کی نسبت یہ اتہام ہے - (۵) چنانچہ یہ تمام اقوال سیوطی نے اتقان بحث

(۱) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۸ مطبوعہ السعادہ مصر ۱۳۲۵ھ (۲) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۵۱ (۳) ایضاً ص ۲۸۰ (۴) ایضاً ج ۳ ص ۸۵ (۵) الاتقان ج ۱ ص ۸۰

متواتر و مشہور میں نقل کئے ہیں ، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ سورتیں ان کے نزدیک داخل قرآن نہ تھیں تو اس سے قرآن مجید کے تواتر و قطعیت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے ؟ اس سے صرف اس قدر نتیجہ نکل سکتا ہے کہ انھوں نے یہ سورتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی تھیں اور اپنے سماع کے سوا وہ اوروں کے سماع کو قطعی نہیں سمجھتے تھے ، ان کو تو بڑی شکایت یہ بھی تھی کہ ان کے ہوتے قرآن مجید زید بن ثابتؓ سے کیوں لکھوایا گیا ، چنانچہ صحیح ترمذی میں روایت ہے کہ " مسلمانو ! میں تو قرآن کی کتابت سے معزول کیا گیا اور وہ شخص (زید بن ثابتؓ) مقرر کیا گیا کہ جب میں اسلام لایا تو وہ ایک کافر کے صلب میں تھا " (۱) ابن ابی داؤد میں ہے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کہتے تھے کہ " میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ستر سورتیں سیکھیں اور زید بن ثابتؓ بچے تھے " (۲) لیکن جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو کاتب وحی مقرر فرمایا تھا تو کسی کو ان کی قابلیت کے انکار کا کیا حق ہے۔

اس تمام بحث میں یہ مسئلہ البتہ مستحق بالذکر ہے کہ اختلاف قراءۃ کیا چیز ہے ؟ اور ان میں جو اختلافات ہیں وہ کس حد تک ہیں اور ان کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے۔

عرب کے مختلف قبائل میں ان الفاظ ، مخارج حروف ، اعراب ، اوزان میں اختلاف تھا ، مثلاً ایک قبیلہ حتیٰ کو عتیٰ کہتا تھا کوئی علامت مضارع کو فتحہ کے بجائے کسرہ سے پڑھتا تھا ، کسی قبیلہ میں مالک کو ملک کہتے تھے ، اس طرح کے کثرت سے اختلافات تھے اور چونکہ ہر قبیلہ اپنے لب و لہجہ پر مجبور تھا ، اس لئے وہ اپنی ہی زبان کے موافق الفاظ ادا کرسکتے تھے ، اسی بنا پر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ " نزل القرآن علی سبعۃ احرف " یعنی قرآن سات حرفوں پر اترا ہے ، محدثین نے تصریح کی ہے کہ سات سے عدد مخصوص مراد نہیں بلکہ کثرت مراد ہے ، یہ اختلافات قراءت جس نوع کے تھے۔ (۳)

---

(۱) صحیح ترمذی ابواب التفسیر تفسیر سورہ توبہ ج ۲ ص ۱۳۲ (۲) یہ روایت مسند احمد ج ۱ ص ۴۱۱ میں بھی ہے۔ک۔ (۳) ابوداؤد کتاب الصلوٰۃ باب انزل القرآن علی سبعۃ احرف ج ۱ ص ۲۰۸

ان کا اندازہ تفصیل ذیل سے ہوگا۔

چند اختلافات متعلق سورہ فرقان

قرات مشہور	قرات غیر مشہور
نَزَّلَ الْفُرْقَانَ	اَنْزَلَ الْفُرْقَانَ
عَلٰی عَبْدِہٖ	علی عبادہ
تَکُوْنُ لَہٗ جَنَّۃٌ	یَکُوْنُ لَہٗ جَنَّۃٌ
ضیقا	ضیقا
مقرنین	مقرنون
مایعبدون من دون اللّٰہ	مایعبدون من دوننا
سراجا	سرجا
قرۃ اعین	قرات اعین
سجدا	سجودا
لماتامرنا	لماتامرنا بہ
یجزون الغرفۃ	یجزون الجنۃ
فقد کذبتم	فقد کذب الکافرون

حافظ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۹ صفحہ ۲۰) میں اس قسم کے تمام اختلافات کا استقصا کیا ہے۔ ان میں سے زیادہ تر بلکہ قریب کل صرف اعراب یا اختلاف لغت کا فرق ہے۔ مثلاً و نادر مترادف الفاظ کا اختلاف ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان اختلافات سے اصلی معنی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ عرب میں سینکڑوں قبیلے تھے اور ان کا لب و لہجہ مختلف تھا۔ صحابہ نے قرآن زبانی سیکھا تھا۔ لکھے ہوئے اجزاء بہت کم تھے۔ عجم کے اختلاط سے لب و لہجہ میں اور تغیر ہوا۔ ان سب حالات کے ساتھ اس قدر اختلاف ہونا ضروری تھا اور شارع نے خود اس میں مسامحت کی۔ لیکن اس سے اس دعویٰ کا ذرہ مطلق تسلیم نہیں ٹوٹ سکتا کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف محفوظ ہے اور آج

تک دنیا میں کوئی کتاب اس طرح محفوظ اور غیر محرف نہیں رہی ۔ اعلان عام کیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کا کوئی ٹکڑا ہو ۔ لے کر آئے ۔ اس بات کا التزام کیا گیا کہ جو شخص کوئی آیت پیش کرتا تھا ، اس پر اوروں کی بھی شہادت لی جاتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان کو قلمبند دیکھا تھا (۱) ایسے صحابہ جن کو قرآن مجید کے اکثر حصے زبانی یاد تھے ، نہایت کثرت سے تھے ، وہ زبانی قرآن مجید کی آیتیں سناتے تھے ، لیکن وہ اسی وقت قلمبند کی جاتی تھیں جب وہ ان کے پاس یا کسی اور صحابی کے پاس قلمبند بھی ملتی تھیں ، اتقان میں حافظ ابو شامہ کا قول نقل کیا ہے کہ :

وکان غرضهم ان لا یکتب الا من عین ما کتب بین یدی النبی لا من مجرد الحفظ (۲)

ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن صرف حفظ کی بنا پر نہ لکھا جائے بلکہ اس کی نقل کی جائے جو آنحضرت کے سامنے قلمبند ہوا تھا ۔

غرض ایک ایک پرزہ ایک ایک ٹھیکری تک جس پر قرآن کی ایک آیت بھی لکھی گئی تھی جمع کئے گئے اور سب کو سامنے رکھ کر حافظوں کی مدد سے حضرت عمرؓ اور زید بن ثابتؓ نے قرآن مجید کا ایک مکمل نسخہ تیار کیا ۔ زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ صرف سورہ توبہ کی دو آیتیں ایسی ملیں جو خزیمہ بن ثابت کے سوا اور کسی کے پاس نہ تھیں ۔

یہ بیان کسی قدر تشریح طلب ہے کہ ۔ زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ صرف سورہ توبہ کی دو آیتیں ایسی ملیں جو خزیمہ بن ثابت کے سوا اور کسی کے پاس نہ تھیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کے جزو قرآن ہونے میں کسی کو کلام نہ تھا ، بات صرف اتنی تھی کہ اس وقت کی تفتیش میں یہ آیتیں ابو خزیمہ کے علاوہ اور کسی کے قرآن میں لکھی ہوئی نہیں ملیں ورنہ خود زید بن ثابت و ابو خزیمہ و حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) کو یہ آیتیں یاد تھیں اور ان کے آیت قرآنی ہونے پر سب کو اتفاق تھا ۔ (۳)

یہ نسخہ جو تیار ہوا حضرت ابو بکرؓ کے خزانہ میں رہا ، ان کے بعد حضرت عمرؓ

(۱) ابو داؤد و اتقان نوع ۱۸ ج ۱ ص ۱۰ (۲) اتقان ج ۱ ص ۱۰ (۳) فتح الباری ج ۹ ص ۱۱ و اتقان ج ۱ ص ۱۰

کے قبضہ میں آیا۔ حضرت عمرؓ کے بعد ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے پاس آیا۔ مروان بن حکم جب مدینہ منورہ کا حاکم مقرر ہو کر آیا تو اس نے حضرت حفصہؓ سے یہ نسخہ مانگ بھیجا۔ انہوں نے انکار کیا۔ ان کے مرنے کے بعد مروان نے عبداللہ بن عمرؓ سے یہ جبر منگوا کر اس کو چاک کر ڈالا۔ چنانچہ فتح الباری میں بہ سند صحیح یہ واقعہ نقل کیا ہے (۱) بنو امیہ کے جو احسانات اسلام پر ہیں ان میں ایک یہ بھی احسان عظیم ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں قرآن مجید کے حفظ و اشاعت کا نہایت اہتمام کیا۔ تمام ممالک مفتوحہ میں قرآن مجید کا درس جاری کیا اور معلموں اور قاریوں کی تنخواہیں مقرر کیں (۲) خانہ بدوش بدویوں میں قرآن کی جبری تعلیم جاری کی، پھر ایک شخص کو جس کا نام ابو سفیان تھا چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا کہ قبائل میں پھر کر ایک ایک شخص کا امتحان لے اور جس کو قرآن مجید کی کوئی آیت یاد نہ ہو اس کو سزا دے (۳) صحابہ میں سے پانچ بزرگ تھے جو مشہور حفاظ قرآن تھے، معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن صامتؓ، ابی بن کعبؓ، ابو ایوبؓ، ابو الدرداءؓ، حضرت عمرؓ نے ان سب کو بلا کر کہا کہ شام کے مسلمانوں کو جا کر قرآن کی تعلیم دیجئے۔ ابو ایوبؓ اور ابی بن کعبؓ نے بیماری اور ضعف کی وجہ سے معذوری ظاہر کی۔ باقی تین صاحبوں نے خوشی سے منظور کیا۔ یہ لوگ پہلے حمص گئے۔ وہاں تعلیم جاری ہو گئی تو عبادہؓ نے وہیں قیام کیا اور ابو درداءؓ دمشق کو اور معاذ بن جبلؓ بیت المقدس کو روانہ ہوئے۔ (۴) علامہ ذہبی نے طبقات القراء میں لکھا ہے کہ ابو الدرداءؓ کی تعلیم کا طریقہ یہ تھا کہ نماز صبح کے بعد جامع مسجد میں بیٹھ جاتے تھے۔ قرآن پڑھنے والے کثرت سے جمع ہوتے تھے۔ دس دس آدمیوں کی ٹکڑیاں کر دی جاتی تھیں اور ہر ٹکڑی پر ایک قاری مقرر کیا جاتا تھا جو شخص

---

(۱) ج ۹ ص ۱۷ (۲) سیرۃ العمرین لابن جوزی (۳) اغانی جزء ۱۰ ص ... و اصابہ میں بھی یہ واقعہ منقول ہے (۴) یہ پوری تفصیل طبقات ابن سعد میں ہے۔ کنز العمال کتاب الاذکار قسم الافعال ج ۱ ص ۲۸۱ میں ابن سعد کی یہ روایت مذکور ہے مطبوعہ دائرہ معارف اسلامیہ حیدر آباد

پورے قرآن کا حافظ ہو جاتا تھا ابو درداءؓ اس کو اپنا شاگرد خاص بناتے تھے، ایک دن شمار کرایا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو طالب العلم اس وقت حلقہ درس میں حاضر ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اشاعت قرآن کے لئے اور بہت سی تدبیریں اختیار کیں، عمال کو لکھ بھیجا کہ جو لوگ قرآن سیکھیں ان کی تنخواہیں مقرر کردی جائیں (۱) عام لوگوں کا تو شمار نہ تھا، حفاظ کی تعداد بھی ہزاروں سے متجاوز ہو گئی، حضرت عمرؓ نے جب فوجی افسروں کو خط لکھا کہ حفاظ قرآن کو میرے پاس بھیج دو کہ میں ان کو تعلیم قرآن کے لئے جابجا بھیجوں تو سعد بن وقاصؓ نے جواب میں لکھا کہ صرف میری فوج میں تین سو حافظ موجود ہیں۔ (۲)

بایں ہمہ چونکہ قرآن کے نسخے نہیں شائع کئے گئے تھے، دائرہ اسلام روز بروز دور دراز ممالک میں پھیلتا جاتا تھا اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہوتی جاتی تھیں، اس لئے الفاظ کے اعراب، تلفظ، وجوہ قرأت میں اختلاف ہوتا گیا اور یہ اختلاف برابر بڑھتا گیا، یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں لوگوں نے ان سے آکر شکایت کی کہ قرآن کی خبر لیجئے، ورنہ اس کی حالت بھی توریت اور انجیل کی حالت ہو جائے گی، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کا مرتب شدہ قرآن حضرت حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کے پاس تھا، حضرت عثمانؓ نے ان کے ہاں سے منگوا بھیجا اور زید بن ثابتؓ، عبداللہ ابن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ، عبدالرحمن بن حارثؓ سے چند نسخے نقل کرائے اور مختلف صوبوں میں بھیجے، (۳) یہ کام ۲۵ھ میں انجام پذیر ہوا، ابن ابی داؤدؒ کی روایت ہے کہ ۱۲ شخص کتابت کے کام پر مقرر کئے گئے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عثمانؓ کا نام جامع القرآن مشہور ہو گیا ہے، حالانکہ ان کو قرآن مجید کے جمع و ترتیب میں کوئی دخل نہیں، انھوں نے جو کچھ کیا وہ

---

(۱) علامہ شبلی نے کنز العمال کی یہ روایت الفاروق حصہ دوم ص ۱۵۱ میں سیرۃ العمرین لابن الجوزی کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ مطبع معارف پریس ۱۹۵۶ء س ن۔ (۲) کنز العمال ج ۱ ص ۲۱۶
(۳) بعض حدیث کی کتابوں میں ہے کہ سات نسخے نقل کرائے تھے، کنز العمال ج ۱، ص ۲۸۲

التی جمع فیها القرآن فی عهد ابی بکر و کانت سور مفرقة کل سورة مرتبة بآیاتها علی حدة لکن لم یرتب بعضها اثر بعض فلما نسخت ورتب بعضها اثر بعض صارت مصحفا ولم یکن مصحفا الا فی عهد عثمان (۱)

کے زمانہ میں لکھے گئے تھے، یہ متفرق سورتیں تھیں جن کی آیتیں مرتب تھیں لیکن خود سورتوں میں باہم کوئی ترتیب نہ تھی، پھر جب ان کی نقل لی گئی اور سورتیں آگے پیچھے رکھی گئیں تو اس کا نام مصحف ہوا اور یہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہوا۔

حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف نقل کرا کے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ، کوفہ، دمشق میں بھجوائے تھے، مدت تک موجود تھے، چنانچہ ان کی تفصیل جیسا کہ مقری نے نفح الطیب میں لکھی ہے، (۲) حسب ذیل ہے۔

دمشق۔ اس مصحف کو ابو القاسم تجیبی نے ۶۹۶ھ میں جامع دمشق کی مقصورہ میں دیکھا، عبدالملک کا بیان ہے کہ میں نے اس کو ۶۵۷ھ میں دیکھا، یہ مصحف میرے سفر قسطنطنیہ کے زمانہ تک دمشق میں موجود تھا، کئی برس ہوئے جب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں جامع مسجد جل گئی تو یہ مصحف بھی جل گیا۔

مدینہ منورہ۔ اس مصحف کا بھی ۷۳۷ھ تک پتہ چلتا ہے، اس نسخہ کی پشت پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی: هذا ما اجمع علیه جماعة من اصحاب رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم منهم زید بن ثابت و عبد اللّٰه ابن الزبیر و سعید بن العاص (اس کے بعد اور صحابہ کا نام تھا)۔

مکہ معظمہ۔ یہ بھی ۶۵۷ھ تک موجود تھا۔

بصرہ یا کوفہ۔ یہ قرآن معلوم نہیں کس زمانہ میں قرطبہ پہنچا، پھر عبدالمومن اس کو قرطبہ سے اپنے دار سلطنت میں بڑے تزک و احتشام سے لایا، ۵۵۲ھ میں وہ معتضد کے قبضہ میں آیا، اس کے بعد ابو الحسن نے جب تلمسان فتح کیا تو یہ نسخہ اس کے قبضہ میں آیا، اس کے مرنے پر پرتگیز میں پہنچا، وہاں سے ایک تاجر نے کسی طرح اس

(۱) عینی شرح بخاری ج ۹ ص ۳۰۱ (۲) نفح الطیب ج ۱ ص ۲۸۸ مطبوعہ مصر

کو حاصل کیا اور ۷۴۵ھ میں شہر فاس میں لایا۔ چنانچہ مدت تک خزانہ شاہی میں موجود تھا۔ (۱)

علامہ مقریزی نے کتاب الخطط میں جہاں قاضی فاضل (سلطان صلاح الدین کا وزیر تھا) کے مدرسہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس کے کتب خانہ میں مصحف عثمانی کا نسخہ موجود تھا جس کو قاضی فاضل نے تیس ہزار اشرفی میں خریدا تھا۔

حضرت عثمانؓ نے اگرچہ قرآن مجید کی متعدد نقلیں شائع کیں۔ لیکن اس وقت تک قرآن میں اعراب (زیر و زبر) اور نقطے نہیں ہوتے تھے اور قریباً ۴۰ برس تک یہی حال رہا۔ اہل عرب کو تو اس کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ ان کی زبان تھی۔ وہ ہر حالت میں صحیح پڑھ سکتے تھے اور پڑھتے تھے۔ لیکن عجم کے لئے بڑی دقت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اعراب کچھ سے کچھ ہو چلا۔ یہ دیکھ کر حجاج بن یوسف نے اپنے کاتبوں کو حکم دیا کہ اعراب اور نقطے لگائیں۔ چنانچہ نصر بن عاصم یا یحییٰ بن یعمر نے یہ خدمت انجام دی۔ (۲)

(۱) نفح الطیب ج ۱ ص ۴۰۵ و مابعد مطبع ازہریہ مصر ۱۳۰۲ھ (۲) ابن خلکان۔ تذکرہ حجاج بن یوسف ج ۱ ص ۱۲۱۔ کتاب الاوائل میں یہ ہے کہ نقطے ابو الاسود دوئلی نے لگائے تھے جو حضرت علیؓ کے شاگرد رشید تھے۔ العقد فی فضائل المصاحف ص ۲ میں بھی ابو الاسود دوئلی کے نقطے لگانے کا ذکر ہے۔ مطبوعہ دمشق ۱۳۵۹ھ۔ س ک۔

علوم القرآن

اس امر سے زیادہ کیا چیز حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ مذہب اسلام کی روح رواں جو کچھ کہو، قرآن ہے، تاہم آج کل مسلمانوں کو جس قدر قرآن کے ساتھ بے اعتنائی ہے، کسی چیز سے نہیں، عربی کے موجودہ درس میں ہر علم و فن کی کتابیں کثرت سے داخل ہیں، لیکن فن تفسیر کی صرف دو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں، جلالین اور بیضاوی، جن میں سے پہلی اس قدر مختصر ہے کہ اس کے الفاظ و حروف قرآن مجید کے الفاظ و حروف کے برابر برابر ہیں اور دوسری گو چنداں مختصر نہیں، لیکن اس کے صرف ڈھائی پارے درس میں داخل ہیں، جو کتاب کا پانچواں حصہ بھی نہیں۔

منطق و فلسفہ کی مدت تحصیل پانچ برس ہے اور اور علوم پر بھی ایک معتد بہ زمانہ صرف ہوتا ہے، لیکن قرآن مجید اور تفسیر کی تحصیل کے لئے پورا سال بھر گوارا نہیں کیا جاتا، عربی علوم و فنون کی کتابیں کثرت سے چھپ چھپ کر شائع ہو رہی ہیں اور خصوصاً فن حدیث کا سرمایہ تو اس قدر موجود ہو گیا ہے کہ اگلوں کے وہم و خیال میں بھی نہ تھا، لیکن قرآن مجید کے متعلق دو ایک معمولی درسی تفسیروں کے سوا آج تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، یہ تو ظاہری بے پروائی کی کیفیت ہے، معنوی حیثیت سے دیکھو تو اس سے بھی زیادہ افسوس ناک حالت ہے، تمام مسلمانوں کے نزدیک قرآن مجید کا معجزہ ہونا اس کی فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ہے، لیکن کیا ہمارے علماء اس دعویٰ کو ثابت کر سکتے ہیں، اگر ان سے پوچھا جائے کہ قرآن مجید کی انشاء پردازی کی کیا خصوصیات ہیں، قرآن مجید نے بلاغت کے کیا کیا نئے اسلوب پیدا کئے، شعرائے جاہلیت نے مدح و ذم، فخر و شادی و غم، عزم و استقلال، بخل و رحم دلی، جوش و اثر کے مضامین کو جس پایہ تک پہنچایا تھا، قرآن مجید نے انہیں مضامین کو کس رتبہ تک

پہنچا دیں؟ تو کیا ہزاروں علماء میں سے ایک بھی ان سوالوں کا معقول جواب دے سکے گا؟ ادب وبلاغت پر موقوف نہیں، فقہ، اصول، علم کلام، سب کا ماخذ قرآن مجید ہے، لیکن ہمارے علماء خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ علوم مذکورہ کے مسائل کو انھوں نے قرآن مجید سے سیکھا ہے یا ہدایہ و تلویح و مقاصد نفسی سے۔

یہ شکایت نئی نہیں، تقریباً چھ سو برس سے یہی حالت ہے، اس سے صرف یہی نہیں ہوا کہ قرآن مجید کے متعلق نئی تالیفات کا سلسلہ بند ہوگیا، بلکہ افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ قدماء کی نادر اور بیش بہا تصنیفات ناپید ہوگئیں، خاص قرآن مجید کے اعجاز پر قدماء نے بہت سی کتابیں لکھی تھیں، جن میں سے آٹھ یا نو کتابوں کا تذکرہ جلال الدین سیوطی نے اتقان میں کیا ہے، لیکن لوگوں کی بد مذاقی سے، ان میں سے صرف باقلانی کی ایک کتاب رہ گئی ہے جو اس باب میں معمولی درجہ کی تصنیف ہے، اگرچہ ابو بکر عربی اس کو احسن الکتب کا خطاب دیتے ہیں۔

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شروع اسلام سے آج تک قرآن مجید کے متعلق جو کچھ علمی سرمایہ مہیا کیا گیا، ان پر ایک مختصر ریویو کیا جائے، جس سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوگا کہ ہمارے اسلاف نے اور علوم کی طرح اس فن کو کس قدر وسیع کیا تھا اور کیا کیا نکتہ آفرینیاں کی تھیں، دوسری طرف یہ ظاہر ہوگا کہ قدماء نے گو اپنے زمانہ کے موافق تحقیقات و تدقیقات کا حق ادا کردیا تھا، تاہم آج اور بہت سے نئے پہلوؤں سے ان مسائل پر بحث کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید جس وقت نازل ہو رہا تھا، اس وقت جو لوگ موجود تھے، وہ اگرچہ اس کے مطالب و معانی کے سمجھنے میں کسی معلم یا استاد کے محتاج نہ تھے، تاہم بعض بعض مقامات میں جہاں زیادہ اجمال ہوتا تھا یا کوئی قصہ طلب بات ہوتی تھی، لوگ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرلیا کرتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد فتوحات کی ترقی اور تمدن کی وسعت کی وجہ سے احکام میں نئی نئی صورتیں پیش آنے لگیں اور اس ضرورت سے قرآن مجید کی آیات احکامیہ پر

غور و فکر کرنے کی ضرورت پڑی۔ صحابہ میں سے جو لوگ علم و فضل میں زیادہ ممتاز تھے، انھوں نے اس طرف زیادہ توجہ کی۔ ان بزرگوں میں سے حضرت علیؓ سب کے پیشرو تھے۔ ان کے بعد حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ کا درجہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے حلقۂ درس نے نہایت وسعت حاصل کی اور سیکڑوں، ہزاروں شاگرد پیدا ہو گئے۔ ان میں سے مجاہد، عطاء بن رباح، عکرمہ، سعید بن جبیر سب سے ممتاز تھے۔ ان بزرگوں کے سوا جن لوگوں نے فن تفسیر پر توجہ کی، وہ حسن بصری، عطاء بن مسلم خراسانی، محمد بن کعب القرظی، ابو العالیہ، ضحاک بن مزاحم، قتادہ، زید بن اسلم، ابو مالک وغیرہ ہیں۔ تابعین میں سب سے پہلے اس فن کی جس نے ابتدا کی وہ سعید بن جبیر تھے۔ عبدالملک بن مروان نے ان سے تفسیر لکھنے کی درخواست کی۔ چنانچہ انھوں نے اس کی فرمائش کے موافق تفسیر لکھ کر دربار خلافت میں بھیجی اور اس کا نسخہ قصر شاہی میں داخل کیا گیا۔ عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور ہے، وہ درحقیقت یہی تفسیر ہے۔ (۱)

اس طبقہ کے بعد اکثر مجتہدین اور ان کے ہم عصروں مثلاً سفیان بن عیینہ، شعبہ، یزید بن ہارون، عبدالرزاق، ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ نے تفسیریں لکھیں۔ اس کے بعد عام رواج ہو گیا اور سیکڑوں، ہزاروں تفسیریں تصنیف ہو گئیں اور ہوتی رہیں۔

تفسیر کے علاوہ قرآن مجید کے خاص خاص مباحث پر جداگانہ اور مستقل تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا اور یہ سلسلہ تفسیر سے بھی زیادہ مفید تھا۔ کسی نے صرف مسائل فقہیہ پر بحث کی۔ کسی نے اسباب نزول پر کتاب لکھی، کسی نے صرف ان الفاظ کو جمع کیا جو غیر زبان کے الفاظ ہیں۔ کسی نے امثال قرآنی کو یکجا کیا، کسی نے آیات مکررہ کے نکات بیان کیے۔ اس قسم کے مضامین کی تعداد ۸۰ ہزار کے قریب پہنچی اور قریباً ہر ایک پر الگ الگ مستقل تصنیفیں لکھی گئیں (۲) ان مضامین میں سے بعض

(۱) یہ تفصیل میزان الاعتدال ذہبی تذکرہ عطاء بن دینار ج ۲ ص ۱۹۸ سے ماخوذ ہے، مطبوعہ السعادۃ مصر ۱۳۲۵ھ (۲) دیکھو اتقان فی علوم القرآن کا دیباچہ۔

بعض پر تمام بڑے بڑے اہل فن نے طبع آزمائیاں کیں اور ہزاروں کتابیں تیار ہو گئیں۔

یہ تصنیفات اگرچہ بے شمار ہیں لیکن ان سب کو چھ قسموں پر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ فقہی، جس میں صرف ان آیتوں کو یکجا کیا ہے جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے، مثلاً احکام القرآن اسماعیل بن اسحاق، احکام القرآن ابو بکر رازی، احکام القرآن قاضی یحییٰ بن اکثم

۲۔ ادبی، ان تصنیفات میں قرآن مجید کا فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجز اور بے نظیر ہونا ثابت کیا ہے، اسی سلسلہ میں وہ تصنیفات بھی داخل ہیں جو قرآن مجید کی حقیقت و مجاز، تشبیہات و استعارات، تکررات، وجوہ ترتیب، صنائع و بدائع وغیرہ وغیرہ پر لکھی گئیں۔

۳۔ تاریخی، قرآن مجید میں انبیائے سابقین اور بزرگوں کے جو قصے مذکور ہیں ان کی تفصیل اور مزید حالات۔

۴۔ نحوی، جس میں قرآن مجید کے نحوی مسائل سے بحث کی ہے، مثلاً اعراب القرآن رازی وغیرہ۔

۵۔ لغوی، یعنی قرآن مجید کے الفاظ مفردہ کے معانی اور ان کی تحقیق، مثلاً لغات القرآن ابو عبیدہ وغیرہ۔

۶۔ کلامی، جن آیتوں سے عقائد کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں ان پر بحث۔

ان مضامین میں سے فقہی مباحث پر جو کچھ لکھا گیا، اس پر اضافہ کی بہت کم گنجائش ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر بڑے بڑے اہل فن نے طبع آزمائیاں کیں اور چونکہ شروع ہی سے ان مسائل کے متعلق الگ الگ فرقے بن گئے تھے، کسی فریق نے تدقیق و تحقیق کا دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، امام شافعی، قاضی یحییٰ بن اکثم، (استاد ترمذی) ابو بکر رازی، جس پایہ کے لوگ تھے سب کو معلوم ہے، ابو بکر رازی کی تصنیف آج بھی موجود ہے اور ہماری نظر سے گزر چکی ہے، اسی طرح لغات قرآن اور مسائل نحویہ پر جو کچھ لکھا گیا، اس سے بڑھ کر نہیں لکھا جاسکتا۔

فصاحت و بلاغت کے متعلق نہایت کثرت سے کتابیں لکھی گئیں، جو اعجاز القرآن کے نام سے مشہور ہیں۔ ان میں فصاحت و بلاغت کے تمام اقسام سے بحث کی ہے۔ سب سے پہلے غالباً جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ نے اس موضوع پر لکھا۔ پھر محمد ابن یزید واسطی، عبد القاہر جرجانی، رمانی، خطابی، زملکانی، امام رازی، ابن سراقہ، قاضی ابوبکر باقلانی نے بسیط اور مفصل کتابیں لکھیں۔ یہ کتابیں آج کل بالکل ناپید ہیں۔

میں نے قسطنطنیہ اور مصر کے تمام کتب خانے دیکھے، لیکن ایک کتاب کا بھی پتہ نہ لگا۔ البتہ قاضی باقلانی کی تصنیف موجود ہے۔ اس کا نسخہ میں نے خدیو کے کتب خانہ سے لکھوا کر منگوایا تھا اور اب وہ چھپ بھی گئی ہے۔ اس کتاب کی نسبت ابن العربی (۱) کا قول ہے کہ اس بحث پر کوئی کتاب اس درجہ کی تصنیف نہیں ہوئی، ابن العربی کی رائے پر اگر بھروسہ کیا جائے تو مصنف کی علمی حالت پر حسرت افسوس ہوگا۔ کیونکہ باقلانی کی کتاب گو انشاء پردازی کے لحاظ سے بلند رتبہ ہے، لیکن اصل مضمون کی حیثیت سے محض ایک عامیانہ تصنیف ہے۔

عبد القاہر جرجانی جو فن بلاغت کا موجد ہے، اس کی اعجاز القرآن ہم نے نہیں دیکھی، لیکن اس کی دو کتابیں دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ جو خاص فن بلاغت میں ہیں، ہمارے پیش نظر ہیں۔ ان کتابوں میں اس نے جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں وہ حیرت انگیز ہیں اور اس لئے قیاس ہوسکتا ہے کہ قرآن مجید پر اس نے جو کچھ لکھا ہوگا، بے مثل ہوگا، اسی طرح جاحظ کی تصنیف بھی بے نظیر ہوگی، لیکن چونکہ پانچ چھ سو برس سے قوم کا علمی مذاق بالکل پست ہوگیا ہے، اس لئے لوگ ابن العربی۔ باقلانی ہی کی تصنیف کو بہترین تصانیف قرار دیتے ہیں۔

اعجاز القرآن کے سلسلہ کے علاوہ اور بہت سی تصنیفات ہیں، جن میں انشاء پردازی کی خاص خاص قسموں سے بحث کی ہے، مثلاً ابن ابی الاصبع نے قرآن مجید کے صنائع و بدائع پر مستقل کتاب لکھی، عزالدین بن عبد السلام نے قرآن کے مجازات

(۱) اتقان بحث اعجاز القرآن نوع ۶۴ ج ۲ ص ۱۰۲

کو جمع کیا۔ ابو الحسن ماوردی نے قرآن کی ضرب الامثال جمع کیں اور ان کی توجیہیں دکھائیں۔ علامہ سیوطی نے سورتوں کے طریق ابتداء پر ایک رسالہ لکھا، جس کا نام الخواطر السوانح فی اسرار الفواتح ہے۔ ابن القیم نے کتاب التبیان اس بحث پر لکھی کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کثرت سے قسمیں کیوں کھائی ہیں۔

قصص اور حقائق اشیاء کے متعلق تصنیفات کا جو سرمایہ ہے، وہ درحقیقت شرم کا باعث ہے اور افسوس اور سخت افسوس ہے کہ تفسیر کے اجزاء میں سے جو حصہ سب سے زیادہ عوام میں مقبول اور متداول ہے اور سلسلہ بہ سلسلہ تمام اسلامی لٹریچر میں سرایت کر گیا، وہ یہی حصہ ہے۔ انبیاء اور صلحائے سابقین کے افسانے جو یہودیوں میں پھیلے ہوئے تھے، وہ نہایت مبالغہ آمیز اور دور از کار تھے۔ قرآن مجید میں نہایت اجمال کے ساتھ صرف ان واقعات کو بیان کیا گیا، جو فی نفسہ صحیح تھے اور جن سے طبائع پر کوئی اخلاقی عمدہ اثر پڑتا تھا۔ ہمارے مفسروں نے قرآن مجید کو ایک فن قرار دیا اور اس کی شرح میں وہ تمام بیہودہ افسانے شامل کر دیئے، جن کے سامنے بوستان خیال کی بھی کچھ حقیقت نہیں۔ حقائق اشیاء کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور تھا، اس کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ چاہ بابل، کوہ قاف، سکندر ذوالقرنین، یاجوج ماجوج وغیرہ وغیرہ کی نسبت جو روایتیں مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہیں، وہ انہی تفسیروں کی بدولت ہیں۔ علامہ ابن خلدون نے اس کے متعلق مقدمہ تاریخ میں نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے۔ ہم اس کی عبارت اس موقع پر بقدر ضرورت نقل کرتے ہیں۔

وقد جمع المتقدمون فی ذلک واوعوا الا ان کتبھم ومنقولاتھم تشتمل علی الغث والسمین والمقبول والمردود والسبب فی ذلک ان العرب لم یکونوا اھل کتاب ولا علم وانما غلبت علیھم

اور اس باب میں متقدمین نے بڑا ذخیرہ جمع کیا، لیکن ان کی تصنیفات اور روایتوں میں نیک و بد، مقبول و مردود سب کچھ شامل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب لکھے پڑھے نہ تھے اور ان پر بالکل بدویت اور جہالت غالب تھی اور جب ان کو اشیاء کی دریافت کا شوق

البداوة والامية واذا تشوقوا الى معرفة شئي مما تتشوق اليه النفوس البشرية فى اسباب المكونات وبدء الخليقة واسرار الوجود فانما يسالون عنه اهل الكتاب قبلهم ويستفيدونه منهم وهم اهل التوراة من اليهود ومن تبع دينهم من النصارى واهل التوراة الذين بين العرب يومئذ بادية مثلهم ولا يعرفون من ذلك الا ما تعرفه العامة من اهل الكتاب فلما اسلموا بقوا على ما كان عندهم مما لا تعلق له بالاحكام التي يحتاطون لها مثل اخبار بدء الخليقة وما يرجع الى الحدثان والملاحم وامثال ذلك وهؤلاء مثل كعب الاحبار ووهب بن منبه وعبد الله بن سلام وامثالهم فامتلأت التفاسير من المنقولات عندهم وتساهل المفسرون فى مثل ذلك وملؤا كتب التفسير من هذه المنقولات واصلها كما قلنا عن اهل التوراة الذين يسكنون البادية ولا تحقيق عندهم بمعرفة ما ينقلونه من ذلك الا انهم

ہوتا تھا۔ جو طبائع بشری کا اقتضاء ہے۔ مثلاً آفرینش عالم کے اسباب، دنیا کی ابتداء، وجود کے اسرار تو ان باتوں کو وہ لوگ یہودیوں سے دریافت کرتے تھے یا ان عیسائیوں سے جو یہودیوں کے مقلد تھے اور اس زمانے کے یہود ایسے ہی جاہل تھے جیسے بادیہ نشین عرب، ان کو صرف وہی معلومات تھیں جو عوام اہل کتاب کو ہوتی ہیں، پھر جب یہ لوگ اسلام لائے تو ان امور کے متعلق جو احکام شرعی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، مثلاً دنیا کا آغاز، واقعات قدیمہ اور قصص انبیاء، ان کے خیالات وہی رہے جو پہلے سے تھے۔ ان اسلام لانے والوں میں کعب احبار، وہب بن منبہ، عبداللہ بن سلام وغیرہ تھے، اس لئے تمام تفسیریں ان کی روایتوں سے بھر گئیں اور اس قسم کے امور میں مفسرین سہل انگاری کرتے ہیں، اس لئے ان لوگوں نے تفسیر کی کتابوں کو انہی روایتوں سے بھر دیا اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ان روایتوں کا ماخذ وہی توراۃ والے تھے جو صحرا نشین تھے۔ اور ان کو ان روایتوں کے متعلق کچھ تحقیق حاصل نہ تھی، لیکن چونکہ مذہباً ان لوگوں کا پایہ بلند تھا اور قوم میں ان کو شہرت

بعد صيتهم و عظمت اقدارهم لما كانوا عليه من المقامات في الدين و الملة فتلقيت بالقبول من يومئذ۔ (۱) | اور عظمت حاصل تھی اس لئے وہ روایتیں قبول عام پاگئیں۔

علامہ ابن خلدون نے جو کچھ لکھا محدثین کی تحقیق بھی تمام تر اسی کی تائید کرتی ہے، انبیائے سابقین اور زمین و آسمان وغیرہ کی آفرینش کے متعلق جو کچھ تفسیروں میں مذکور ہے وہ عموماً قدماء مفسرین سے ماخوذ ہے۔ یعنی مجاہد، سدی، ضحاک، مقاتل بن سلیمان، کلبی، ان میں سے تین مقدم الذکر نے صحابہ کا زمانہ پایا تھا اور ان سے روایتیں حاصل کی تھیں۔ مقاتل نے ۱۵۰ھ میں وفات پائی، کلبی بھی اسی دور کے مفسر ہیں۔ نقلی مضامین کے متعلق آج جس قدر تفسیریں ہیں سب انھیں بزرگوں سے ماخوذ ہیں، امام شافعیؒ کا قول ہے کہ فن تفسیر میں تمام لوگ مقاتل کے وظیفہ خوار ہیں، (۲) سدی کی نسبت جلال الدین سیوطی نے کتاب الارشاد سے نقل کیا ہے کہ امثل التفاسیر تفسیر السدی یعنی تمام تفسیروں میں سدی کی تفسیر سب سے اچھی ہے، امام طبری کی تفسیر کے متعلق تمام علماء کا اتفاق ہے کہ صحت و تنقید میں لاجواب ہے، لیکن یہ تفسیر بھی زیادہ تر سدی اور ضحاک سے ماخوذ ہے، چنانچہ جلال الدین سیوطی نے اتقان باب ہشتاد و دوم میں تصریح کی ہے۔ (۳)

ان بزرگوں کا یہ حال ہے کہ مجاہد کی تفسیر کی نسبت جب لوگوں نے امام اعمش سے دریافت کیا کہ اس میں غلطیاں کیوں پائی جاتی ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ وہ اہل کتاب سے ماخوذ ہے، (ج ۳ ص ۹) ضحاک کی نسبت محدثین نے تصریح کی ہے کہ ابن عباسؓ اور ابوہریرہؓ وغیرہ سے انھوں نے جو روایتیں کی ہیں سب مخدوش ہیں یعنی ان کی صحت میں کلام ہے، اس کے ساتھ یحییٰ بن سعید قطان نے جو اسماء الرجال کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ ضحاک میرے نزدیک ضعیف الروایہ ہیں، (ج ۱ ص ۵۰۳)

(۱) مقدمہ ابن خلدون باب علوم القرآن جزء اول ص ۳۶۵ و ما بعد مطبوعہ التقدم مصر۔

(۲) میزان الاعتدال ذہبی ج ۳ ص ۱۹۶ (۳) اتقان نوع ۸۰ و سیوطی ج ۲ ص ۱۸۹

سدی کا یہ حال ہے کہ امام شعبی سے کسی نے کہا کہ سدی کو قرآن کے علم کا حصہ ملا ہے تو انہوں نے کہا کہ قرآن کے جہل کا حصہ ملا ہے۔ مقاتل کی نسبت وکیع کا قول ہے کہ کذاب تھا۔ محدث نسائی فرماتے ہیں کہ مقاتل جھوٹ بولا کرتا تھا۔ عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہیں کہ مقاتل کی تفسیر بہت اچھی تھی کاش وہ ثقہ بھی ہوتا۔ جوزجانی نے لکھا ہے کہ مقاتل نہایت دلیر دجال تھا۔ محدث ابن حبان نے لکھا ہے کہ مقاتل قرآن مجید کے متعلق یہود و نصاریٰ سے وہ باتیں سیکھا کرتا تھا جو ان کی روایتوں کے مطابق ہوتی تھیں (ج ۳ ص ۱۹۶) کلبی کی نسبت تو عام اتفاق ہے کہ ان کی تفسیر دیکھنے کے قابل نہیں، امام احمد بن حنبل، دار قطنی، امام بخاری، جوزجانی، ابن معین سب نے تصریح کی ہے کہ وہ ناقابل اعتبار تھا۔ ابن حبان کا قول ہے کہ کلبی کا کذب و دروغ اس قدر ظاہر ہے کہ اس میں کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں (۱) ایک مسیحی تذکرہ میں ان بزرگوں کی اس قدر پردہ دری شاید موزوں نہ تھی لیکن ان لوگوں نے اسلام کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے اس کا کم سے کم یہی صلہ تھا۔ انہیں حضرات کی روایتیں ہیں جن سے تفسیر کبیر، کشاف، بیضاوی اور سینکڑوں جزروں کتابیں مالا مال ہیں۔ مسلمانوں میں آج جو عجائب پرستی، ضعیف الاعتقادی اور غلط خیالی ایک خاصہ بن گئی ہے، انہیں کی روایات اور منقولات کی بدولت ہے۔

(۱) ان لوگوں کے یہ اقوال میزان الاعتدال ذہبی سے ماخوذ ہیں۔

اعجازِ قرآن

فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (بقرہ ۲: ۲۳)

تیرہ سو برس سے دنیائے اسلام میں یہ آواز گونج رہی ہے کہ قرآن کا جواب نہیں ہو سکتا۔ سنی، شیعی، معتزلی، اشعری، ماتریدی، سب اس میں متفق اللفظ ہیں، لیکن جب یہ سوال ہوتا ہے کہ قرآن کا اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے تو دفعۃً اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ قرآن میں پیشین گوئیاں ہیں اور یہ بشر کا کام نہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ قرآن کا جواب تو ہو سکتا ہے لیکن جب کوئی جواب لکھنے کا قصد کرتا ہے تو خدا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ قرآن لوگوں کے مخفی ارادوں کا حال بتا دیتا تھا اور آخر اشاعرہ کی اس راز کشائی پر تمام عالم کا اتفاق ہو گیا کہ چونکہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا جواب نہیں ہو سکتا، اس لئے وہ کلام الٰہی ہے۔

ابھی ہم کو اس سے بحث نہیں کہ کیا انشا پردازی اور زور تحریر بھی ایسی چیز ہے جو خدا کا کارنامہ قرار پائے۔ بلکہ جس پر تعجب اور سخت تعجب ہے وہ یہ ہے کہ تیرہ سو برس تک یہ گفت و شنید، یہ بحث و نزاع، یہ اختلاف آرا ہوتا رہا، لیکن کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس سوال کا جواب اسی سے پوچھنا تھا، جس نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ یہ دعویٰ خود قرآن ہی نے کیا ہے اور خود ہی اس سوال کا جواب دے سکتا تھا۔

ہم کو یہ دیکھنا چاہئے کہ جب خدا قرآن کی نسبت یہ کہتا ہے کہ تمام عالم اس کی نظیر نہیں لا سکتا تو جا بجا قرآن کے صریح اوصاف کیا بیان کرتا ہے؟ خدا نے قرآن مجید کی نسبت نہایت کثرت سے مختلف اوصاف بیان کئے ہیں، مثلاً:

وَالْقُرْآنِ الْحَكِيمِ ۝ (یٰسین ۳۶: ۲) — قسم ہے قرآن کی جو کہ حکیم ہے۔

وَالْقُرْآنِ ذِي الذِّكْرِ ۝ (ص ۳۸: ۱) — اور قرآن کی جو ناصح ہے۔

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ۝ (ہود ۱۱: ۱) — ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط ہیں۔

كِتَابٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ ۔ (مومنون ۲۳: ۶۲)	ایسی کتاب ہے جو ٹھیک ٹھیک کہتی ہے۔
كِتَابٌ مُّبِيْنٌ ۔ (نمل ۲۷: ۱)	روشن کتاب ہے۔
بَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدٰى ۔ (بقرہ ۲: ۱۸۵)	رہنمائی کے کھلے دلائل ہیں۔
هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۔ (بقرہ ۲: ۲)	پرہیزگاروں کی رہنما ہے
جَعَلْنَاهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَاءُ ۔	ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ جسکو چاہتے ہیں اسکے ذریعہ سے راستہ دکھاتے ہیں۔ نیک
هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۔ (لقمان ۳۱: ۳)	آدمیوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔
تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۔ (زمر ۳۹: ۲۳)	اس سے ان لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے خدا سے ڈرتے ہیں۔
كِتَابٌ فُصِّلَتْ اٰيَاتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۔ (فصلت ۴۱: ۳)	ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں کھول کر بیان کی گئی ہیں عربی کا قرآن ہے جاننے والوں کے لئے۔
بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۔ (بقرہ ۲: ۱۱۹)	خوش خبری دینے والا ہے اور ڈرانے والا ہے۔
يَهْدِيْ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (احقاف ۴۶: ۳۰)	حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف راہ دکھاتا ہے۔
تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۔ (طٰہٰ ۲۰: ۳)	ڈرنے والے کے لئے نصیحت ہے۔

غور کرو قرآن مجید کی فضیلت کے بیان میں اس کو ناصح، رحمت، بشیر، نذیر، نور، حکیم، واضح سب کہا، لیکن فصاحت و بلاغت کا کہیں نام تک نہیں آیا اور وہی چیز چھوڑ دی گئی، جو (لوگوں کے نزدیک) مدار اعجاز ہے۔ کیا ہدایت اور حکمت کے لحاظ سے کوئی کتاب قرآن کا جواب ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں ہو سکتی تو یہ اوصاف کیسے معجزہ نہ ہوں اور وہ وصف معجزہ ہو جس کا ذکر تک قرآن میں نہیں۔

اس کے یہ معنی نہیں کہ فصاحت و بلاغت میں قرآن کا جواب ہو سکتا ہے، بے شبہ نہیں ہو سکتا اور قیاس تک نہیں ہو سکتا، لیکن کتاب آسمانی کا رتبہ اس

نام ہونا معجزہ ہو سکتا ہے نہ کہ شاعری اور انشاء پردازی۔ حضرت یوسفؑ بے شبہ جمال ظاہری میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لیکن پیغمبری کی حیثیت سے ان کے اوصاف کمال میں ان کی نفس قدسی کا ذکر کرنے گا نہ کہ ان کے خط و خال کا۔ لیکن ہم کو ان دلائل اور قیاسات کی بھی ضرورت نہیں۔ قرآن مجید میں صاف مذکور ہے کہ وہ ہدایت کے لحاظ سے معجزہ ہے یعنی ان وصف میں (بجز کتاب آسمانی کے) کوئی کتاب اس کی نظیر نہیں بن سکتی۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ (قصص ۲۸: ۴۹)	کہدو اے محمدؐ کہ خدا کے یہاں سے کوئی کتاب ان دونوں کتابوں (قرآن، توریت) سے بڑھ کر ہدایت کرنے والی لاؤ تو میں ان کا پیرو بنتا ہوں، اگر تم سچے ہو۔

ایک نکتہ بیان قابل لحاظ ہے اور وہ اس بحث کا فیصلہ قطعی ہے۔ معجزہ دو قسم کا ہو سکتا ہے۔ ایک جس سے براہ راست منصب نبوت کو تعلق ہو۔ ایک وہ جو بالذات نہیں، بلکہ بواسطہ دلیل نبوت قرار پائے۔ مثلاً ایک پیغمبر دعویٰ کرتا ہے کہ میں پیغمبر ہوں یعنی مجھ کو خدا نے دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ پیغمبری کا ثبوت کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہوں اور میری ہتھیلی چاند کی طرح چمکتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس معجزہ کو ہدایت اور پیغمبری سے کیا تعلق؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ میں جو معجزہ دکھاتا ہوں خدا کے سوا کوئی شخص اس پر قادر نہیں، اس لئے میں جو یہ معجزہ پیش کرتا ہوں تو خدا ہی کی طرف سے کرتا ہوں اس بنا پر میں خدا کی طرف سے آیا ہوں اور جو شخص خدا کی طرف سے آتا ہے، وہ پیغمبر ہوتا ہے۔ اس استدلال میں معجزہ براہ راست نبوت سے تعلق نہیں رکھتا۔

ایک دوسرا شخص کہتا ہے کہ میں پیغمبر ہوں۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کیوں؟ وہ فرماتے ہیں کہ میں جس قسم کی ہدایت اور لوگوں کا تزکیہ نفس کر سکتا ہوں۔ کوئی بشر نہیں کر سکتا۔ اب اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو یہی دعویٰ براہ راست معجزہ بھی ہے اور

خاصۂ نبوت بھی، معجزہ اس لئے ہے کہ جو چیز کوئی اور بشر نہ پیش کر سکے وہ معجزہ ہوئی اور خاصۂ نبوت اس لئے کہ تزکیۂ نفس ہی کا نام پیغمبری ہے اس کو ایک اور صاف مثال میں سمجھو، ایک شخص کہتا ہے کہ میں فارسی زبان جانتا ہوں اور دلیل یہ پیش کرتا ہوں کہ میں ایرانی ہوں اور ایرانی ضرور فارسی جانتا ہوگا، اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص یہی دعویٰ کرتا ہے، لیکن دعویٰ کو فارسی ہی زبان میں ادا کرتا ہے کہ من فارسی را خیلے خوب می دانم، یہ دعویٰ، دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی۔

قرآن مجید اگر فصاحت، بلاغت کے لحاظ سے معجزہ قرار دیا جاتے تو ایسا معجزہ ہوگا جو نبوت کا خاصہ نہیں کیونکہ انشاء پردازی لازمہ نبوت نہیں، لیکن اگر قرآن مجید کو تزکیۂ نفس اور موعظت و حکمت کے لحاظ سے معجزہ کہا جائے تو یہ معجزہ بھی ہوگا اور خاصۂ نبوت بھی۔

فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ ۔ (یونس ۱۰ : ۳۲)

****

****

قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں؟

مخالفوں نے قرآن مجید پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے۔ اس اعتراض کے متعدد پہلو ہیں۔

۱۔ سب سے پہلا یہ کہ خود قرآن میں قسم کھانے کی برائیاں ہیں ا وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ (بقرہ ۲: ۲۲۴) خدا کو اپنی قسموں کا ہدف نہ بناؤ۔ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ (القلم ۶۸: ۱۰) زیادہ قسم کھانے والوں کا کہنا مان۔

۲۔ آدمی جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے یا اس کی عظمت و تعظیم کے لحاظ سے کھاتا ہے یا محبت اور شیفتگی کی وجہ سے۔

قرآن مجید میں خدا نے جو قسمیں کھائی ہیں، تعظیم اور عظمت کے لحاظ سے تو نہیں ہو سکتیں کیونکہ خدا سے بڑھ کر کون ہے۔

دوسرا احتمال ممکن تھا، لیکن قرآن میں جن معمولی اور ادنیٰ چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں ان کے لحاظ سے یہ احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔

قرآن میں انجیر اور زیتون تک کی قسم موجود ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ خدا کو یہ میوے نہایت عزیز اور محبوب ہیں، اس لئے ان کی قسم کھائی۔

اس بحث سے قطع نظر کر کے قسم کھانا فی نفسہ ایک ہلکی کی بات ہے، قسم وہی کھاتا ہے جس کو اپنی نسبت اطمینان نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی بات کو بے تکلف یقین کر لیں گے، یہی وجہ ہے کہ بازاری آدمی بات بات پر قسم کھاتے ہیں، خواص ان

سے کم اور مقاصد تو مطلق قسم نہیں کھاتے! ایران میں مثل ہے کہ "گفتی باور نمودم، مکرر گفتی در شک افتادم، قسم خوردی دروغ دانستم"۔

مفسرین نے اس شبہ کے عجیب عجیب جواب دیے ہیں۔

۱۔ قسم کھانا، عرب کا عام طریقہ تھا اور جزو زبان بن گیا تھا، اس لئے جو کلام عرب کی زبان میں نازل ہوگا وہ اس سے بری نہیں ہو سکتا۔

۲۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب عقائد اسلام کی صحت پر قرآن مجید کی حجتیں پیش کرتے تھے تو کفار کہتے تھے کہ یہ باتیں درحقیقت غلط ہیں، لیکن یہ قرآن کا سامر فریب استدلال اور زور عبارت ہے کہ غلط کو صحیح ثابت کر دیتا ہے۔ اس شبہ کے رفع کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا کہ قسم کھا کر ان کو یقین دلایا جائے۔

۳۔ جن چیزوں، مثلاً انجیر اور زیتون وغیرہ کو تم بے حقیقت سمجھتے ہو، درحقیقت عظیم الشان چیزیں ہیں، چنانچہ امام رازی وغیرہ نے فلسفیانہ دلائل سے زیتون اور انجیر کی خوبیاں ثابت کی ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے جوابات مخالف کو تو بالکل مطمئن نہیں کر سکتے اور موافق کے لئے اعتراض و جواب کی سرے سے ضرورت ہی نہیں، اس کو کلام الٰہی کے آگے چون و چرا سے کیا غرض ع مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے۔

مولوی حمید الدین صاحب جن کا ذکر الندوہ کے ایک پرچہ میں ایک خاص تقریب سے آچکا ہے، قرآن مجید کے حقائق و اسرار پر جو کتاب عربی زبان میں لکھ رہے ہیں، اس کے بعض اجزاء آج کل ہم کو ہاتھ آئے، ان میں اس مسئلہ پر بھی بحث تھی انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، نہایت محققانہ اور ادیبانہ لکھا ہے، اس لئے ہم اس کا خلاصہ اس موقع پر درج کرتے ہیں۔

اس عقدہ کے حل کرنے کے لئے پہلے قسم کی حقیقت اور اس لفظ کی تاریخ پر غور کرنا چاہئے۔

چونکہ اس طریقہ ادا سے واقعہ کا یقین دلانا مقصود ہوتا ہے، اس لئے یہ طریقہ رفتہ رفتہ قسم کے معنی میں مستعمل ہونے لگا، یعنی کسی کی گواہی پیش کرنی اور قسم کھانا ایک چیز ہوگئی

عمرو معدی کرب کا شعر ہے:

اللہ یعلم ما ترکت قتالھم — خدا جانتا ہے کہ میں نے لڑنا نہیں چھوڑا

یہاں "خدا کا جانتا ہے" کا لفظ قسم کے معنوں میں آیا ہے یعنی خدا کی قسم میں نے لڑنا نہیں چھوڑا۔

ہماری زبان میں عام طور سے قسم کے موقع پر کہتے ہیں "اللہ جانتا ہے، خدا شاہد ہے، خدا گواہ ہے" خود قرآن مجید میں گواہی کا لفظ قسم کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، مثلاً وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ أَنْ تَشْهَدَ أَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ إِنَّهُ لَمِنَ الْكَاذِبِينَ ۔ (النور ۲۴: ۸) قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۔ (المنافقون ۶۳: ۱) اِتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً ۔ (مجادلہ ۵۸: ۱۰) پچھلی آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے۔

"منافقین کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک تو خدا کا رسول ہے اور خدا جانتا ہے کہ بیشک تو خدا کا رسول ہے، لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہیں، منافقوں نے اپنی قسم کو سپر بنا لیا ہے" دیکھو اس آیت میں منافقین کی زبان سے جو لفظ نقل کیا وہ صرف یہ تھا کہ "ہم تمہارے پیغمبر ہونے کی گواہی دیتے ہیں" پھر آگے چل کر فرمایا کہ منافقین اپنی قسم کو سپر بناتے ہیں، حالانکہ منافقین نے قسم کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا تھا بلکہ صرف گواہی دینے کا لفظ استعمال کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اسی گواہی کو خدا نے قسم قرار دیا

عربی زبان نے جب زیادہ وسعت حاصل کی تو بعض بعض حروف قسم کے لئے خاص ہوگئے مثلاً واو، ب، ت، عام محاورہ ہے: وَاللّٰہِ، بِاللّٰہِ، تَاللّٰہِ۔

اب قسم کے دو مفہوم ہیں۔

ایک یہ کہ جب کوئی واقعہ یا مسئلہ بیان کیا جائے تو اس پر کوئی شہادت پیش کی جائے چاہے یہ شہادت ذی روح کی ہو یا اشیاء کے زبان حال کی شہادت ہو۔

دوسرے یہ کہ صرف ایک بات کی توثیق اور یقین دلانے کے لئے کسی بڑے شخص یا کسی عزیز چیز کی قسم کھائی جائے۔ یہ دوسرا مفہوم قسم کا مجازی استعمال ہے جو رفتہ رفتہ عام ہو گیا۔ اصل میں قسم کے یہ معنی نہ تھے۔

قرآن مجید میں جہاں جہاں قسم کا لفظ آیا ہے پہلے معنی کے لحاظ سے آیا ہے۔ خدا جب اپنی قدرت و شان کا اظہار کرتا ہے تو آفتاب کی، چاند کی، ستاروں کی، دن رات کی قسم کھاتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ یہ تمام چیزیں اس کے وجود اور عظمت و شان کی گواہی دے رہی ہیں۔ قرآن مجید میں خود اس کی تصریح موجود ہے کہ قسم کا استعمال اسی معنی میں ہے۔

وَالْفَجْرِ وَلَيَالٍ عَشْرٍ وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ وَاللَّيْلِ إِذَا يَسْرِ هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ ‎(فجر)‏

اور دس راتیں جفت اور طاق اور رات جب چلنے پر ہو۔ ان باتوں میں صاحب عقل کے لئے قسم ہے۔

قسم کا لفظ یہاں صاف اسی معنی میں آیا ہے۔ خدا نے پہلے چند چیزیں گنائیں، پھر فرمایا کہ ان چیزوں میں صاحب عقل کے لئے قسم ہے۔ یعنی یہ چیزیں عقلمند کے نزدیک خدا کے وجود اور قدرت کی شہادت دے رہی ہیں۔

خدا نے جا بجا مظاہر قدرت مثلاً آفتاب، ماہتاب، دریا، ہوا، بادل، چرند، پرند کو آیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے معنی نشانی کے ہیں۔ یعنی یہ چیزیں خدا کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ

آسمان اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے اول بدل میں اور جہاز میں جو لوگوں کے فائدہ کی چیزوں کو لے کر دریا میں چلتے ہیں اور آسمان سے جو پانی اترا ہے کہ جس سے مردہ

مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا	زمین کو زندہ کر دیتا ہے اور تمام چوپائے جو
وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ	پھیلا دیے ہیں ان میں اور ہواؤں کے چلنے
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ	میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے بیچ
وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (بقرہ ۲۰)	میں مسخر ہے، جاننے والوں کے لئے نشانیاں ہیں

اسی طرح قرآن میں نہایت کثرت سے تمام مظاہر قدرت کی نسبت نشانیوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اب خود کرو یہی چیزیں جن کو اکثر موقعوں پر نشانیاں بتایا ہے، انھیں چیزوں کی جا بجا قسم بھی کھائی ہے۔ جس کے صاف یہ معنی ہیں کہ یہ چیزیں خدا کی قدرت کی گواہی دے رہی ہیں اور قسم کا صحیح استعمال بھی ہے۔

ایک بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ عربی زبان میں قسم کے قریب معنی اور جو الفاظ ہیں ان میں لوگ امتیاز نہیں کرتے۔ عربی زبان میں اس قسم کے تین لفظ ہیں۔ قسم، یمین، حلف، عام لوگ ان سب الفاظ کو ہم معنی سمجھتے ہیں اور اسی وجہ سے عظیم الشان غلطیاں پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ ان سب الفاظ کے مفہوم الگ الگ ہیں۔

قسم کے معنی تو وہی ہیں جو گزر چکے۔ یعنی کسی واقعہ کی صحت کے لئے شہادت پیش کرنی۔ قرآن میں جو قسمیں مذکور ہیں سب کے یہی معنی ہیں کہ جن چیزوں کی قسم کھائی ہے، وہ خدا کے ثبوت پر، اسکی عظمت و شان پر، اسکی وسعت قدرت پر زبان حال سے گواہی دے رہی ہیں۔ چنانچہ سورہ فجر میں صاف تصریح ہے۔ هَلْ فِي ذَٰلِكَ قَسَمٌ لِّذِي حِجْرٍ (الفجر: ۵)

یمین کے لفظی معنی ہاتھ کے ہیں۔ یہ لفظ عموماً معاہدات کی توثیق کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور جس چیز پر یہ لفظ آتا ہے، اسکو مقدس رکھنا مقصود ہوتا ہے۔ لغت کی کتابوں میں ہے:

ان الیمین اصلها ضرب الیمین	معاہدہ کرنے والے جو ہاتھ پر ہاتھ مارتے
من المتعاقدین [۱]	ہیں۔ یہ لفظ اسی سے نکلا ہے۔

(۱) یمین کا یہی لفظی معنی [illegible] کے ساتھ لسان العرب ج ۱۳ ص ۴۶۰ میں بھی مذکور ہے۔

قضا و قدر اور قرآن مجید

وہ مسائل جن کی گرہ، فلسفہ اور مذہب دونوں میں سے ایک بھی نہ کھول سکا ان میں سے ایک یہ مسئلہ بھی ہے۔ فلسفہ کو مذہب پر تقدم کا دعویٰ ہے، اس لئے ہم کو پہلے اس سے پوچھنا چاہئے کہ وہ اس عقدہ کو کہاں تک حل کر سکا لیکن پہلے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کر لینا چاہئے۔

۱۔ ہر چیز کی فطرت خدا یا قدرت نے جس خاص طرح کی پیدا کی ہے، اس کے خلاف اس سے کوئی فعل سرزد نہیں ہو سکتا۔ جماد حرکت نہیں کر سکتا، نباتات بات نہیں کر سکتے، جانور منطق و فلسفہ نہیں سیکھ سکتے، آدمی روح مجرد نہیں بن سکتا۔ انسان کے افراد کی بھی مختلف فطرتیں ہیں۔ جو شخص فطرۃً شریر ہے نیک نہیں ہو سکتا۔ کودن ذہین نہیں بن سکتا، احمق عاقل نہیں کیا جا سکتا۔

شاید تم کو یہ خیال ہو کہ تعلیم و تربیت سے اکثر لوگوں کی حالتیں بدل جاتی ہیں، شریر لڑکا نیک چلن ہو جاتا ہے۔ مسرف کفایت شعار بن جاتے ہیں، بدمزاج حلیم ہو جاتے ہیں، لیکن یہ بھی ان کی فطرت ہی کا اثر ہے، یعنی ان کی فطرت ہی میں اصلاح اور ترقی کا مادہ ہوتا ہے، جس نسبت سے یہ مادہ ہوتا ہے، اسی قدر وہ اصلاح پذیر ہو سکتے ہیں، لیکن جن کی فطرت میں اصلاح کا مادہ نہیں دیا ہے۔ لیکن ایک خاص درجہ تک ہے، وہ اصلاح پذیر ہو سکتے ہیں، یا اس درجہ سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

۲۔ جس چیز کو ہم ارادہ اور اختیار کہتے ہیں یہ بھی مجبوری کی ایک صورت ہے۔ فرض کرو ایک شخص فطرۃً نفس پرست ہے، اس کو یہ موقع ہاتھ آیا کہ تنہائی ہے، ایک دل فریب صورت سامنے ہے، اس کی طرف سے قرو استدعا ہے، اس حالت میں

یہ شخص اگر بدکاری کا ارادہ کرتا ہے تو یہ ارادہ اس کے اختیار کی چیز نہیں۔ عام طور پر لوگ سمجھا کرتے ہیں کہ خواہش اور ارادہ ہماری اختیاری باتیں ہیں۔ لیکن یہ ایک وسیع غلطی ہے۔ کسی کام کی خواہش کے جب تمام اسباب جمع ہو جائیں گے تو ممکن نہیں کہ خواہش نہ پیدا ہو۔ اس لئے خواہش خود بھی ایک مجبوری کی بات ہے۔ لہذا کسی چیز کو اختیار کرنا بھی دراصل ہمارے اختیار میں نہیں۔

جو شخص کسی کام پر مجبور ہے یعنی وہ فعل اس سے مجبوراً سرزد ہوتا ہے، اس کی نسبت اس پر کچھ الزام نہیں عاید کیا جا سکتا۔ کسی شخص کے ہاتھ میں اگر رعشہ ہو اور وہ لکھ نہ سکے تو کوئی شخص اس کو نہ لکھنے پر ملامت نہیں کر سکتا۔

ان مقدمات کے ثابت ہونے کے بعد اب فلسفہ سے پوچھنا چاہئے کہ انسان مختار ہے یا مجبور یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ انسان جو نیکی یا بدی کرتا ہے تو یہ اس کا اختیاری فعل ہے یا اضطراری؟ اگر انسان خود مختار ہے تو مذکورہ بالا مقدمات کا جن سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ انسان کا کوئی فعل اختیاری نہیں، کیا جواب ہے اور اگر مجبور ہے تو پھر کسی شخص کو کسی قسم کا الزام کیوں کر دیا جا سکتا۔ بدچلن شریر، ونی الطبع، مفسدہ انگیز اشخاص کو ہم کس بنا پر برا کہہ سکتے ہیں۔

مذہب میں ہمیشہ سے دو فرقے ہوتے چلے آئے ہیں، جبریہ۔ قدریہ۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ الفاظ اسلام نے پیدا کئے ہیں۔ آج کل یورپین قوم مسلمانوں کے تنزل کی بڑی وجہ یہ بتاتی ہیں کہ اسلام جبریہ عقیدہ کی تعلیم کرتا ہے۔ اس بنا پر مسلمانوں کی زبان پر یہ الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے۔ قسمت میں یہی لکھا تھا۔ نوشتہ تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں پر جو آفتیں آتی ہیں، بجائے اس کے وہ مستعد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں کہ تقدیر کا کون مقابلہ کر سکتا ہے۔

لیکن یہ ایک تاریخی غلطی ہے۔ جس طرح اسلام میں قدریہ و جبریہ دو فرقے ہیں، تمام اور مذاہب میں بھی ہمیشہ سے یہ دونوں فرقے موجود تھے اور جس طرح مسلمان

تقدیر کے قائل ہیں۔ عیسائیوں میں بھی بڑے بڑے پیشوایان مذہب اس کے قائل رہتے آئے ہیں۔ عیسائیوں میں یہ فرقے دا یولا اور ڈومنیک کے نام سے موسوم تھے اور ان دونوں میں باہم سخت اختلاف اور نزاع تھی۔ ۱۳۰۸ء سے لے کر سترہویں صدی کے اخیر تک دونوں فرقوں میں سخت لڑائیاں رہیں اور گو پوپ نے اس کی روک کے لئے بہت سے احکام صادر کئے۔ لیکن ان کا کچھ اثر نہ ہوا۔ اخیر زمانہ میں جینس اور مولن تھے جو اپنے اپنے فرقہ کے پیشوا تھے، بڑی معرکہ آرائیاں ہوئیں۔ جینس سولہویں صدی عیسوی میں تھا اور علم کلام کا درس دیتا تھا۔ اس نے بیکل کے سامنے کھڑے ہو کر مولن کی کتاب کو مردود قرار دیا اور ثابت کیا کہ یہ کتاب دراصل پیلاگس کے خیالات سے ماخوذ ہے جو پانچویں صدی عیسوی میں تھا اور جس کا یہ مذہب تھا کہ حضرت آدمؑ نے جو گناہ کیا، وہ پہلے سے قضائے الٰہی میں نہ تھا اور اسی لئے وہ خود اس گناہ کے ذمہ دار تھے۔ مولن نے اس کے مقابلہ میں ثابت کیا کہ جینس درحقیقت کلون کا پیرو ہے، جس نے سولہویں صدی عیسوی میں پراٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد قائم کی تھی۔ بالآخر یہ جھگڑے پوپ کے سامنے پیش کئے گئے، لیکن پوپ کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ کلیمن ہشتم سے لے کر پولس پنجم تک یہ مقدمہ یوں ہی پڑا رہا۔ سپین کے سفیر نے ڈومنیک فرقہ کی سفارش بھی کی، لیکن پولس نے کچھ فیصلہ نہ کیا اور یہ اجازت دی کہ دونوں فرقے آزادی سے اپنے اپنے خیالات شائع کریں۔

جینس بالکل جبر کا قائل تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ خدا براہ راست۔ تمام چیزوں کی علت ہے اور جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم سے ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انسان میں ایک قوت اختیاری پائی جاتی ہے، اس لئے جینس کے جانشینوں نے یہ قرار دیا کہ خدا انسان میں ارادہ پیدا کرتا ہے اور ارادہ خود مختار ہے، اس لئے انسان اپنے ارادہ میں بالکل آزاد ہے۔

بالآخر ایک تیسرا مذہب ایجاد ہوا یعنی یہ کہ خدا بھی فاعل مختار ہے اور انسان بھی، اس مذہب کا مدون پوسوئے تھا۔ اب تک اس مسئلہ کے متعلق صرف دو لفظ

استعمال کئے جاتے تھے۔ تقدیر اور اختیار۔ جوہریہ نے تیسرا لفظ تقدیر مطلق ایجاد کیا۔ جوہریہ نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب لکھی، جس میں اس نے انسان کا خود مختار ہونا ثابت کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ”ایک ہی بات دوسری ہی بات کو مٹا نہیں سکتی اس سے ہرگز انکار نہیں ہوسکتا کہ خدا کا علم مطلق ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کو بھی اپنے افعال کا اختیار حاصل ہے، بے شبہ ان دونوں باتوں میں تناقض نظر آتا ہے، لیکن اس میں عقل کو دخل نہیں دینا چاہئے، کیونکہ یہ مسئلہ عقل انسانی کی حد سے باہر ہے۔ اس سلسلہ کے دونوں سرے ہاتھ میں لینے چاہئیں۔ لیکن جو کڑی ان دونوں سروں کو باہم ملاتی ہے وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے“ (۱) [دیکھو رسالۃ الاسلام مصنفہ پروفیسر ہنری دی کاستری فرانسیسی۔ مترجمہ بزبان عربی مطبوعہ مصر۔ فصل جبر و قدر ص ۹۵ تا ۹۸]۔

اسلام میں نہایت ابتدائی زمانہ سے یہ بحث شروع ہوگئی تھی، اگرچہ اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید میں اس کے متعلق بظاہر دونوں قسم کی آیتیں آئی ہیں، لیکن اس کی طرف خیال رجوع ہونے کا سبب یہ ہوا کہ بنو امیہ کے زمانہ میں ظلم اور تعدی جاری تھی، اہل عرب اپنی فطری آزادی کی وجہ سے اس پر اعتراض کرتے تھے۔ اس کے جواب میں بنو امیہ کے طرفدار کہتے تھے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، خدا کی مرضی سے ہوتا ہے، اس لئے کسی کو دم نہیں مارنا چاہئے۔ معبد جہنی نے حضرت حسن بصری سے پوچھا کہ کیا بنو امیہ کا یہ عذر صحیح ہے؟ انہوں نے کہا یہ خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں، (۲) معبد نے اس کے بعد علانیہ بغاوت کا علم بلند کیا اور جان سے مارا گیا، یہ پہلا دن تھا کہ اس مسئلہ کا اعلان ہوا۔

چوتھی صدی کے آغاز میں امام ابوالحسن اشعری نے جبر و قدر کے درمیان

(۱) امام رازی نے مطالب عالیہ میں بالکل یہی تقریر کی ہے۔ لیکن امام صاحب جوہریہ سے پہلے تھے، اس لئے اس کو توارد کہنا چاہئے اور اگر سرقہ ہے تو جوہریہ اس جرم کا مجرم ہوگا نہ امام رازی (۲) مقریزی ج ۲ ص ۳۵۶ مطبوعہ مصر۔

میں ایک تیسرا طریقہ ایجاد کیا اور اس کا نام کسب رکھا، یعنی یہ کہ انسان اپنے افعال کا کاسب ہے، فاعل نہیں، انسان کو اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے، لیکن یہ قدرت کچھ اثر نہیں رکھتی، قدرت کو تسلیم کرنا اور پھر یہ کہنا کہ قدرت کا کچھ اثر نہیں گویا یہ کہنا ہے کہ ایک چیز ہے اور پھر نہیں ہے، اسی بنا پر یہ فقرہ مشہور ہے کہ تین چیزیں علم کلام کے عجائبات میں سے ہیں، ان میں سے ایک امام اشعری کا کسب ہے، اسی بنا پر امام الحرمین نے اس مذہب سے بالکل انکار کیا، چنانچہ اس کی تفصیل ابن القیم کی کتاب شفاء العلیل میں مذکور ہے۔

قرآن مجید میں اس مسئلہ کے متعلق دونوں قسم کی آیتیں آئی ہیں، امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو جن آیتوں سے استدلال کرتے ہیں، حسب ذیل ہیں:۔

جن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو کچھ اختیار نہیں۔

لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ۔ [آل عمران ۳: ۱۲۸]	تجھ کو کام میں کچھ اختیار نہیں۔
قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ [نساء ۴: ۷۸]	کہدے کہ سب خدا کی طرف سے ہے۔
وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَاۗءَ اللّٰہُ۔ [تکویر ۸۱: ۲۹]	اور تم کسی بات کی خواہش نہیں کر سکتے جب تک خدا نہ چاہے۔
وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ [صافات ۳۷: ۹۶]	اور خدا نے تم کو بھی پیدا کیا ہے اور تمہارے اعمال کو بھی۔
اَللّٰہُ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ۔ [زمر ۳۹: ۶۲]	خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔
وَاِنْ تُصِبْھُمْ حَسَنَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ [نساء ۴: ۷۸]	اور ان کو کچھ بھلائی کا پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے۔
وَاِنْ تُصِبْھُمْ سَیِّئَۃٌ یَّقُوْلُوْا ھٰذِہٖ مِنْ عِنْدِکَ قُلْ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ۔ [نساء ۴: ۷۸]	اور برائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے کہدے کہ یہ سب خدا کی طرف سے ہے

جن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے

برائی کرتا ہے۔

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۔ (بقرہ ۲ : ۲۶)
خدا اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے

وَيُضِلُّ اللَّهُ الظَّالِمِينَ ۔ (ابراہیم ۱۴ : ۲۷)
اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے۔

كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُرْتَابٌ ۔ (غافر ۴۰ : ۳۴)
اسی طرح خدا اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے بڑھ جاتا ہے اور شکی ہوتا ہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا ۔ (اسراء ۱۷ : ۱۶)
اور جب ہم کسی گاؤں کو خراب کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے دولت مندوں کو حکم دیتے ہیں۔ جب وہ گناہ کرنے لگتے ہیں۔

جن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کافروں اور فاسقوں کو ہدایت کرنا نہیں چاہتا یا ان کو ہدایت نہیں کرتا۔

اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ۔ (بقرہ ۲ : ۲۶۴)
خدا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۔ (صف ۶۱ : ۵)
خدا فاسقوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔ (احقاف ۴۶ : ۱۰)
بے شبہ خدا ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

(اس مضمون کی آیتیں نہایت کثرت سے ہیں)

وہ آیتیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے کافروں کو ایمان نہ لانے پر مجبور کر دیا ہے۔

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۔ (بقرہ ۲ : ۷)
خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھ پر پردہ ہے۔

وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً ۔ (مائدہ ۵ : ۱۳)
اور ہم نے ان کے دلوں کو سخت بنا دیا۔

وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ۔ (اعراف ۷ : ۱۰۰)	اور ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیتے ہیں اس لئے وہ نہیں سنتے۔
كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الْكٰفِرِيْنَ ۔ (اعراف ۷ : ۱۰۱)	اسی طرح خدا کافروں کے دل پر مہر کر دیتا ہے۔
فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ ۔ (منافقون ۶۳ : ۳)	تو خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی اس لئے وہ نہیں سمجھتے۔
وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ (توبہ ۹ : ۹۳)	اور خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی اس لئے وہ نہیں جانتے۔
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۔ (نحل ۱۶ : ۱۰۸)	یہ وہ لوگ ہیں کہ خدا نے ان کے دلوں پر۔ کانوں پر اور آنکھوں پر مہر کر دی۔

(اس مضمون کی اور بہت سی آیتیں ہیں)

وہ آیتیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اگر چاہتا تو سب کو ہدایت کرتا۔ لیکن اس نے یہ چاہا ہی نہیں۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى ۔ (انعام ۶ : ۳۵)	اگر خدا چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔
وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدٰىهَا ۔ (سجدہ ۳۲ : ۱۳)	اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دیتے۔
وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۔ (سجدہ ۳۲ : ۱۳)	لیکن ہماری یہ بات طے ہو گئی ہے کہ ہم دوزخ کو آدمیوں اور جنوں سے بھر دیں گے۔
وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ۔ (یونس ۱۰ : ۹۹)	اور اگر تیرا خدا چاہتا تو دنیا میں جس قدر آدمی ہیں سب ایمان لاتے۔
وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ	اور ہم نے بہت سے آدمی اور جن دوزخ

وَالْإِنْسِ ۔ (اعراف ۷: ۱۷۹) — کے لئے پیدا کئے۔

وہ آیتیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہی نے شیاطین اور بدکاروں کو اس کام پر مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔

أَلَمْ تَرَ أَنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ۔ (مریم ۱۹: ۸۳) — تو نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر مقرر کیا۔

وَجَعَلْنَاهُمْ أَئِمَّةً يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ ۔ (قصص ۲۸: ۴۱) — اور ہم نے ان کو پیشوا بنایا ہے کہ لوگوں کو آگ (دوزخ) کی طرف بلاتے ہیں۔

آیات مذکورہ بالا کے مقابلہ میں حسب ذیل آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا، گمراہ کرنا شیطان کا کام ہے، انسان اپنے افعال کا آپ ذمہ دار ہے۔

يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ۔ (نساء ۴: ۶۰) — شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہت زیادہ گمراہ کر دے۔

مَنْ ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۔ (یونس ۱۰: ۱۰۸) — جو شخص گمراہ ہوتا ہے تو اپنے کئے سے ہوتا ہے۔

وَلَقَدْ أَضَلَّ مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيرًا أَفَلَمْ تَكُونُوا تَعْقِلُونَ ۔ (یٰس ۳۶: ۶۲) — شیطان نے تم میں سے بکثروں کو گمراہ کیا تو کیا تم کو عقل نہ تھی۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَكِنَّ النَّاسَ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۔ (یونس ۱۰: ۴۴) — خدا لوگوں پر مطلق ظلم نہیں کرتا۔ لیکن لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔

لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۔ (بقرہ ۲: ۲۸۶) — انسان کو جو کچھ نفع و ضرر پہنچتا ہے، اپنے فعل کی بدولت پہنچتا ہے۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّى هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۔ (آل عمران ۳: ۱۶۵) — کیا جب تم پر کوئی ایسی ہی مصیبت آئی جیسے پہلے بھی آچکی ہے تو تم کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی، کہدو! کہ یہ تمہاری ذات سے ہے۔

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللَّهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ ۔ (النساء ۴: ۷۹) — تجھ کو جو بھلائی پہنچتی ہے وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی پہنچتی ہے وہ تیرے نفس کی وجہ سے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ۚ (رعد ۱۳ : ۱۱)	خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے۔
مَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ ۚ (شوریٰ ۴۲ : ۳۰)	تم پر جو مصیبت آتی ہے تو تمہارے کئے کی وجہ سے آتی ہے۔
ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (روم ۳۰ : ۴۱)	خشکی اور تری میں فساد پھیل گیا لوگوں کے کرتوت کی وجہ سے۔
وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ (زمر ۳۹ : ۷)	خدا اپنے بندوں کے لئے کفر کو نہیں پسند کرتا۔
إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۚ (اعراف ۷ : ۲۸)	خدا بری بات کا حکم نہیں دیتا۔
وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِن دُونِهِ مِن شَيْءٍ ۚ (نحل ۱۶ : ۳۵)	اور مشرکین کہتے ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو ہم خدا کے سوا اور کسی چیز کی عبادت نہ کرتے۔
سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا (انعام ۶ : ۱۴۸)	مشرکین یہ کہیں گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا۔

دونوں قسم کی آیتیں بظاہر برابر کا درجہ رکھتی ہیں۔ ایک آیت میں صاف تصریح ہے کہ خدا بری بات کا حکم نہیں دیتا۔ دوسری آیت میں ہے کہ جب ہم کسی مقام کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے دولت مندوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ گناہ کریں۔ ایک آیت میں ہے کہ جو مصیبت آتی ہے تمہاری وجہ سے آتی ہے۔ دوسری آیت میں ہے کہ یہ نہ کہو بلکہ سب خدا کی طرف سے ہے۔ ان آیتوں پر اچھی طرح غور کرنے نے جبریہ و قدریہ دو فرقے پیدا کر دیئے۔ اشاعرہ نے دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہا۔ لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرا طریقہ جو انہوں نے اختیار کیا، وہ دونوں سے بدتر تھا۔ اسی بنا پر امام رازی نے صاف صاف جبر کا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ تفسیر کبیر میں ان تمام آیتوں کی تاویل

کی ہے، جس سے انسان کا مختار ہونا ثابت ہوتا ہے۔

ایک نکتہ یہاں خاص طرح پر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ تم نے دیکھ لیا کہ آیتیں دونوں قسم کی موجود ہیں اور ہر قسم کی آیت اپنے مفہوم پر گویا نص قطعی ہے، اس لئے اگر صرف نصوص قرآنی پر نظر ہو تو جبر و قدر، دونوں مذہب میں سے جون سا چاہے، انسان اختیار کر سکتا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ دونوں قسم کی آیتیں بظاہر، اس قدر مساوی الدرجہ ہیں کہ انسان کسی پہلو کو چھوڑ نہیں سکتا۔ باوجود اس کے دو مخالف گروہ جو پیدا ہوئے اور دونوں نے اپنے فریق مخالف کو کافر قرار دیا، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یہ دراصل اس اختلاف طبائع کا اثر ہے، جو انسان کے مختلف افراد میں پایا جاتا ہے، بعض آدمی بالطبع کاہل، پست ہمت، ضعیف الارادہ ہوتے ہیں، اس لئے ان کا میلان طبع وہ سہارے ڈھونڈھتا ہے، جن سے انسان کا مجبور و ناچار ہونا ثابت ہے، بخلاف اس کے جو اشخاص فطرۃً عالی حوصلہ، بلند ہمت، راسخ العزم، قوی الارادہ ہوتے ہیں، ان کی نگاہیں، ان باتوں پر پڑتی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان تمام دنیا کا حکمراں ہے اور اپنے عزم اور ارادہ سے چاہے تو تمام عالم کے مرقع کو دفعۃً الٹ پلٹ کر دے۔

سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں بظاہر جو تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے۔

۱۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں خدا کی مشیت یا حکم اور ارادہ کا ذکر ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، فطری اور شرعی، خدا نے جن چیزوں کی جو فطرت بنائی ہے اس کو بھی حکم اور ارادہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۔ (یٰس ۳۶: ۸۲)

اس کا حال یہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ خلقت اشیاء کے وقت خدا یہ لفظ بولا نہیں کرتا۔

وَكَانَ أَمْرُ اللّٰهِ مَفْعُولًا ۔ (نساء ۴: ۴۷) اور خدا کا حکم ہو کر رہتا ہے۔

یہ وہی فطری حکم ہے، جو تو خود بخود ہو کر رہتا ہے۔ ورنہ خدا کے شرعی احکام تو اکثر لوگ بجا نہیں لاتے اور ان کی تعمیل کا واقع ہونا ضروری نہیں۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا ۔ (اسراء ۱۷: ۱۶)	جب ہم کسی گاؤں کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے لوگوں کو حکم دیتے ہیں کہ وہ فسق کریں۔

یہ بھی وہی فطری حکم ہے۔ یعنی جب کوئی مقام تباہ ہوتا ہے تو وہاں کے لوگوں کی طبیعتوں میں بدکاری کا مادہ پیدا کیا جاتا ہے، اس لئے وہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَا الشَّيَاطِينَ عَلَى الْكَافِرِينَ تَؤُزُّهُمْ أَزًّا ۔ (مریم ۱۹: ۸۳)	ہم نے شیطانوں کو کافروں پر مقرر کیا ہے کہ وہ ان کو برانگیختہ کریں۔

یہاں بھی یہ مراد نہیں کہ خدا شیطانوں کو حکم دیتا ہے کہ جاؤ اور کافروں کو گناہ کی ترغیب دو۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ خدا نے کافروں کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ ان میں برائی کا مادہ شروع ہی سے موجود ہوتا ہے۔

ایک آیت میں ہے کہ "خدا نے زمین اور آسمان سے کہا کہ خوشی یا زبردستی جس طرح سے ہو حاضر ہو۔ دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں" (فصلت ۴۱: ۱۱) یہ بھی اسی فطری حالت کا بیان ہے۔ یعنی آسمان اور زمین کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ ان سے وہی حرکات صادر ہوتے ہیں جو ان کی فطرت کا اقتضاء ہے۔

محدث ابن القیم نے اپنی کتاب شفاء العلیل میں ایک خاص باب باندھا ہے، جس کی سرخی یہ ہے:

الباب التاسع والعشرون فی انقسام القضاء والحکم والارادۃ والکتابۃ والامر والاذن والجعل والکلمات والبعث والارسال والتحریم والانشاء الی کونی متعلق بخلقہ والی دینی	انتیسواں باب اس بیان میں کہ خدا کا فیصلہ، حکم، ارادہ، کتابت، امر، اجازت، کسی چیز کو مقرر کرنا، بات کرنا، بھیجنا، حرام کرنا، پیدا کرنا، ان سب کی دو قسمیں ہیں، ایک کونی (فطری) جو فطرت سے متعلق ہے اور

متعلق با مرہ ـ (۱) دوسری شرعی جو احکام سے متعلق ہے۔

محدث موصوف نے اس باب میں قرآن مجید کی ان تمام آیتوں کا استقصاء کیا ہے، جن میں یہ الفاظ (ارادہ، حکم وغیرہ) فطرت اور اصل خلقت کے معنی میں آئے ہیں، چنانچہ ہم نے جو آیتیں اوپر نقل کیں، بجز اخیر آیت کے باقی تمام محدث موصوف نے بھی نقل کی ہیں اور بتایا ہے کہ ان سے صرف فطری اور خلقی حالت مراد ہے۔

جن آیتوں میں یہ مذکور ہے کہ خدا بدکاروں کو برائی کا حکم دیتا ہے، اس سے فطری حالت مراد ہے اور جن آیتوں میں یہ مضمون ہے کہ خدا کسی شخص کو برائی کا حکم نہیں دیتا، اس سے شرعی حکم مراد ہے، اس بنا پر ان دونوں آیتوں میں کسی طرح کا تعارض نہیں۔ باقی یہ امر کہ خدا نے ایسی فطرت کیوں بنائی جس سے برائی سرزد ہو، اس کا جواب آگے آئے گا۔

۲۔ خدا نے تمام عالم میں علت و معلول کا سلسلہ قائم کیا ہے، اشاعرہ گو اس اصول کے منکر ہیں، لیکن ان کے سوا تمام حنفیہ اور محدثین وغیرہ اسی کے قائل ہیں۔ محدث ابن القیم نے شفاء العلیل میں اس مضمون کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ اس سلسلہ کا انکار کرنا بداہت اور شریعت دونوں کا انکار کرنا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

فانکار الاسباب والقوی والطبائع جحد للضروریات وقدح فی العقول والفطر ومکابرۃ للحس وجحد للشرع۔	تو سلسلہ اسباب اور قویٰ اور اشیاء کی طبیعت کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہے اور عقل اور فطرت پر اعتراض کرنا ہے اور محسوسات اور شریعت کا انکار کرنا ہے۔

اور آگے چل کر لکھتے ہیں۔

بل الموجودات کلہا اسباب ومسببات والشرع کلہ اسباب	بلکہ تمام موجودات اسباب اور مسببات ہیں اور شریعت تمام تر اسباب اور

(۱) شفاء العلیل ص ۲۰۰ مطبع حسینیہ مصر ۱۳۲۳ھ

ومسببات ..... والقرآن مملوء من اثبات الاسباب.

مسببات ہیں اور قرآن اسباب کے اثبات سے بھرا ہوا ہے۔

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:۔

ولو تتبعنا ما یفید اثبات الاسباب من القرآن والسنة لزاد علی عشرة الآف موضع ولم نقل ذلک مبالغة بل حقیقة ویکفی شهادة الحس والعقل والفطر (۱)

اور اگر ہم ان تصریحات کو جمع کریں جن سے قرآن مجید اور حدیث سے سلسلۂ اسباب کا ثبوت ہے تو دس ہزار سے زیادہ تصریحات نکلیں گی اور ہم نے یہ بات مبالغۃً نہیں کہی بلکہ واقعی کہی ہے اور حس اور عقل اور فطرت کی گواہی کافی ہے۔

لیکن یہ تمام سلسلہ اسباب خود قائم نہیں ہو گیا، بلکہ خدا نے قائم کیا ہے۔ اب ان متعارض آیتوں پر لحاظ کرو، جن میں انسان کے افعال کو کہیں خود انسان کی طرف منسوب کیا ہے اور کہیں یہ کہا ہے کہ سب خدا کے افعال ہیں، انسان کی طرف کا منسوب کرنا، اسی سلسلہ اسباب کے لحاظ سے ہے، انسان میں خدا نے ارادہ اور خواہش کی قوت پیدا کی ہے، یہ خواہش انسان کو کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس کام کا سبب ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ تمام سلسلۂ اسباب خود خدا کا قائم کیا ہوا ہے، اس لئے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ افعال انسانی تحت خدا ہی ہے، اسی بنا پر قرآن مجید میں کہا ہے کہ:۔

مَا تَشَاؤُوْنَ اِلَّا اَنْ یَّشَاءَ اللّٰهُ (انسان ۷۶ : ۳۰)

تم کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتے جب تک کہ خدا نہ چاہے۔

اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اگر خدا نے انسان کی فطرت میں خواہش کی قوت نہ رکھی ہوتی اور خدا انسان کا صاحب ارادہ ہونا نہ چاہتا تو انسان میں خواہش کا مادہ ہی نہ ہوتا، اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ خدا نہ چاہتا تو انسان کسی چیز کو چاہ بھی نہیں سکتا۔

ان دونوں پہلوؤں کی تصریح کرنے کی ضرورت یہ تھی کہ اسلام سے پہلے

(۱) شفاء العلیل ص ۱۸۸ و ۱۸۹ مطبعہ حسینیہ مصر ۱۳۲۳ھ

افعال انسانی کی نسبت دو خیال تھے، ایک یہ کہ خدا کوئی چیز نہیں، انسان خود بخود سلسلۂ فطرت کے اقتضاء سے پیدا ہوا اور ہر قسم کی قوتیں خود بخود اس کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئیں، انھیں قوتوں کی بنا پر اس سے افعال صادر ہوتے ہیں اور ان افعال کا وہ خود خالق ہے۔

اس کے مقابل دوسرا فرقہ تھا جس کا یہ مذہب تھا کہ انسان مجبور محض ہے، وہ خود کچھ نہیں کرتا اور نہ کر سکتا، بلکہ اس سے خدا کراتا ہے۔

اسلام نے ان دونوں خیالوں کو غلط ثابت کرنا چاہا، اس لئے ضرور تھا کہ جہاں وہ یہ بتائے کہ انسان اپنے افعال کا خالق ہے اور اپنے ہر فعل کا ذمہ دار ہے، ساتھ ہی یہ بھی بتائے کہ انسان خود بخود نہیں پیدا ہوا، بلکہ اس کو اور اس میں جس قدر قوتیں موجود ہیں، سب خدا نے پیدا کیں، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ (نساء: ۷۸) یعنی سب خدا کی طرف سے ہے۔

۳۔ انسانوں کی فطرت خدا نے مختلف طور پر پیدا کی ہے، بعض فطرۃً شریر، بدکار، ضدی اور گردن کش ہوتے ہیں، اس فطرت کو قرآن مجید میں ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ خدا نے ان کے دلوں پر مہر کر دی ہے، ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے، ان کے آگے اور پیچھے دیواریں کھڑی کر دی ہیں، وہ اندھے بہرے گونگے ہیں۔

بعض کی فطرت اس طرح کی بنائی ہے کہ ابتداء میں اگر وہ برائی سے بچنا چاہیں تو بچ جائیں لیکن جب وہ احتیاط نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بری صحبتوں میں ڈال دیتے ہیں تو برائی کا مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ پکے شریر اور بدکار بن جاتے ہیں، یہاں تک کہ اب اگر وہ برائی سے اپنے آپ کو روکنا بھی چاہیں تو نہیں روک سکتے، اس قسم کی فطرت کو قرآن مجید میں ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (بقرہ: ۱۰) — ان کے دل میں بیماری تھی تو خدا نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا

فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۔ — تو جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو خدا نے بھی ان

(صف ۶۱:۵)	کو ٹیڑھا کر دیا۔
بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (مطففین ۸۳:۱۴)	بلکہ جو کچھ انھوں نے کیا تھا وہ ان کے دل پر چھا گیا۔
بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ۔ (نساء ۴:۱۵۵)	بلکہ خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دل پر مہر کر دی۔

نیکی کی فطرت کا بھی یہی حال ہے، یعنی بعض فطرۃً نیک اور بہت ہی نیک ہوتے ہیں، بعض میں نیکی کا معمولی، وہ ہوتا ہے۔ لیکن اچھی صحبت اور تعلیم و تربیت سے ترقی کرتا ہے، اس دوسری فطرت کو قرآن مجید میں اس طرح تعبیر کیا ہے:

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى۔ (محمد ۴۷:۱۷)	اور جو لوگ ہدایت پر چلتے ہیں تو خدا ان کی ہدایت کو اور بڑھا دیتا ہے۔
قُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ۔ (احزاب ۳۳:۷۰)	تم ٹھیک بات کہو تو خدا تمہارے کام کو ٹھیک کر دے گا۔

جو خدا نے تمام اشیاء کو خاص خاص فطرت پر پیدا کیا ہے اور کوئی چیز اپنی فطرت سے بدل نہیں سکتی، یعنی جس چیز کی جو فطرت ہے، ضرور اس سے ظہور میں آئے گی، اس کو قرآن مجید میں مختلف طریقوں سے بیان کیا ہے۔

لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ۔ (روم ۳۰:۳۰)	خدا کی صنعت میں تبدیلی نہیں۔
مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ۔ (ملک ۶۷:۳)	تو خدا کی صنعت میں ناہمواری نہ دیکھے گا۔
رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى۔ (طٰہٰ ۲۰:۵۰)	ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا، پھر اس کو راستہ دکھایا۔
لَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا۔ (فاطر ۳۵:۴۳)	تو خدا کے طریقہ اور عادت میں اس بدل نہ پائے گا
لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا۔ (احزاب ۳۳:۶۲)	تو خدا کے طریقہ اور عادت میں تبدیلی نہ پائے گا۔
اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ۔ (قمر ۵۴:۴۹)	ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ خاص سے پیدا کیا۔

قرآن مجید میں جا بجا یہ جو بیان کیا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دے دیتے، ہم چاہتے تو تمام دنیا کا ایک ہی مذہب ہوتا، اس سے یہ مطلب نہیں کہ موجودہ فطرت کے ساتھ ہر شخص ہدایت پاسکتا اور تمام دنیا کا ایک مذہب ہو جاتا۔ کیونکہ آیات مذکورہ بالا سے ثابت ہوا کہ خدا نے جس چیز کی جو فطرت بنا دی ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، اس لئے موجودہ حالت میں انسانی فطرت کا جو اقتضا ہے۔ یعنی مختلف العقیدہ اور مختلف الافعال ہونا یہ بدل نہیں سکتی، بلکہ مطلب یہ کہ ہم اگر چاہتے تو انسانوں کی جو فطرت ہے، اس کے خلاف دوسری فطرت پر اس کو بناتے اور اس حالت میں سب کا ایک مذہب پر ہونا ممکن تھا۔

غرض قرآن مجید میں یہ مسئلہ قطعی طور پر بیان کیا گیا ہے کہ تمام چیزیں اپنی اپنی فطرت کے موافق کام کرتی ہیں اور جس کی فطرت کا جو اثر ہے، اس سے خواہ مخواہ ظہور میں آتا ہے، اس کے ساتھ (جیسا کہ اوپر گذر چکا) تمام عالم میں علت و معلول اور سبب و مسبب کا سلسلہ بھی قائم ہے۔

ان دونوں اصول کی بنا پر آسانی سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں اور ان کی بنا پر انسان کو جو عذاب و ثواب ہوگا یہ سب تو فطرت کا اقتضا ہے، انسان سے نیک و بد افعال کا سرزد ہونا اس کی فطرت کا اقتضا ہے اور ان دونوں افعال کی بنا پر عذاب و ثواب کا وقوع میں آنا بھی خود ان افعال کی فطرت کا نتیجہ ہے۔ خدا نے فطرت کو پیدا کیا۔ لیکن پھر فطرت اپنے مقتضیات کو پیدا کرتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ خدا نے زہر پیدا کیا ہے اور زہر میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جو زہر کھاتا ہے مر جاتا ہے، اب جو شخص زہر کھاتا ہے، وہ خود زہر کے اثر سے مرتا ہے، امام غزالیؒ عذاب و ثواب کی حقیقت کے متعلق مضمون بالا ہی قریب قریب لکھتے ہیں:-

اما العقاب علی ترک الامر و ارتکاب النهی فلیس العقاب من الله تعالیٰ غضبا و انتقاما و مثال ذلک ان من اوراق قاع عاقبه الله تعالیٰ بعدم	احکام کے چھوڑنے اور منہیات کے کرنے پر عذاب کا ہونا، تو یہ اس بنا پر نہیں کہ خدا کو غصہ آتا ہے اور وہ انتقام لیتا ہے، بلکہ اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص عورت کے ساتھ

بالولد ...... ومن ترک الاکل والشرب عاقبۃ بالجوع والعطش ...... فکذلک نسبۃ الطاعات والمعاصی الی الآلام الآخرۃ واللذاتہا من غیر فرق فالسوال عن انہ لم تفضی المعصیۃ الی العقاب کالسوال فی انہ لم یھلک الحیوان عن السم ولم یودی السم الی الہلاک (۱)

جو بستری نہ کرے گا خدا اس کو اولاد نہ دے گا اور جو شخص کھانا پینا چھوڑ دے گا، خدا اس کو بھوک اور پیاس کا عذاب دے گا۔ عبادت اور گناہ سے قیامت میں جو عذاب و ثواب ہوگا اس کے بعینہ یہی مثال ہے۔ اس بنا پر یہ پوچھنا کہ گناہ پر عذاب کیوں ہوتا ہے، گویا یہ پوچھنا ہے کہ جاندار زہر سے کیوں مر جاتا ہے اور زہر کیوں مار ڈالتا ہے۔

غرض یہ سب اسی قانون فطرت کے سلسلہ میں داخل ہے۔ انسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ نیکی اور بدی کرتا ہے اور نیکی و بدی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی روح کو آرام اور تکلیف پہنچتی ہے، اسی کا نام عذاب و ثواب ہے۔ قرآن مجید میں اس نکتہ کو یوں ادا کیا ہے۔

وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ (عنکبوت ۵۴)

یعنی کفار تجھ سے کہتے ہیں کہ عذاب جلدی لا حالانکہ دوزخ ان کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔

۵۔ اوپر کی تقریر سے اس بحث کے متعلق اگرچہ شبہات رفع ہو گئے، لیکن اصلی گرہ اب تک نہیں کھلی۔ تمام اعتراضات اس مرکز پر آکر جمع ہوتے ہیں کہ پھر خدا نے ایسی فطرت ہی کیوں بنائی جس سے برائی سرزد ہو سکے، یہ ممکن نہ تھا کہ انسان فطرۃ ایسا بنایا جاتا کہ اس سے برائی سرزد ہی نہ ہوتی۔

اس عقدہ کے حل کرنے کے لئے اس بات پر غور کرو کہ اگر ایک چیز میں بہت سے فائدے ہوں اور کچھ نقصان بھی ہو تو تم کیا کرو گے؟ کیا اس کو بالکل چھوڑ دو گے یا اسی بنا پر اختیار کرو گے کہ گو تھوڑا سا نقصان ہے لیکن فائدے بہت زیادہ ہیں۔ تمام دنیا کا کاروبار اسی اصول پر چل رہا ہے۔ اولاد سے زیادہ انسان کو کیا چیز عزیز ہے،

(۱) کتاب المضنون بہ علی غیر اہلہ، مطبعہ میمنہ مصر

لیکن اولاد کی پرورش اور پرداخت میں کن کن مصیبتوں کا سامنا ہے۔ خود انسان کی زندگی جو اس کو سب سے زیادہ عزیز ہے، کس قدر مصائب سے بھری ہوئی ہے۔ تاہم ان مسرتوں اور خوشیوں کے مقابلہ میں جو انسان کو زندگی کی وجہ سے یا اولاد سے حاصل ہوتی ہیں، یہ تکلیفیں ناقابل اعتنا ہیں۔ آگ سے ہمارے سیکڑوں کام نکلتے ہیں، کیا ہم اس کو اس بنا پر مضر سمجھتے ہیں کہ اس سے کبھی کبھی ہمارے کپڑوں میں آگ بھی لگ جاتی ہے۔

انسان کی فطرت کے متعلق چار احتمال پیدا ہو سکتے تھے، دنیا انسان بنایا جاتا جو ہمہ تن نیکی ہوتا۔ ہمہ تن بدی ہوتا۔ نیکی کا مادہ اس میں زیادہ ہوتا، بدی کا مادہ زیادہ ہوتا۔ دوسری اور چوتھی قسم حکمت اور انصاف کے خلاف تھی، اس لئے خدا نے اس قسم کی فطرت نہیں بنائی۔ پہلی اور تیسری قسم عین حکمت تھی، اس لئے انسان اسی فطرت کے موافق پیدا کیا گیا۔

شاید تم کو خیال ہو کہ بعض انسان ہمہ تن شرارت ہوتے ہیں، اس لئے ان کا پیدا کرنا خلاف حکمت ہے، لیکن یہ غلط ہے، جس کو تم ہمہ تن شرارت سمجھتے ہو، اس کے ان تمام افعال و اقوال پر نظر ڈالو، جو اس سے رات دن سرزد ہوتے ہیں، ان میں بہت سے بہت فی صدی دس کام برے ہوں گے، جو شخص بے انتہا جھوٹ بولنے کا عادی ہے، وہ بھی دن رات میں بمشکل دس پانچ جھوٹ بولتا ہوگا۔

غرض انسان، بلکہ دنیا میں جتنی چیزیں ہیں ان میں مضرت و نقصان فائدہ کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اس لئے اگر ان چیزوں کو سرے سے نہ پیدا کیا جاتا تو تھوڑے سے نقصان کے لئے بہت سے فائدوں کو ترک کرنا ہوتا اور یہ حکمت و مصلحت کے بالکل خلاف ہے، محدث ابن القیم نے اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، ان کے چند فقرے یہ ہیں:۔

ومن تامل هذا الوجود علم ان الخير فيه غالب وان الامراض

اور جو شخص عالم موجودات پر غور کرے گا، اس کو معلوم ہوگا کہ اس میں بھلائی کا پلہ بھاری

وان كثرت فالصحة اكثر منها واللذات اكثر من الآلام والعافية اعظم من البلاء ...... ومثال ذلك الانهار فى وجودها منافع كثيرة فيها مفاسد لكن اذا قابلنا بين مصالحها ومفاسدها لم تكن لمفاسدها نسبة الى مصالحها وكذلك المطر والرياح والحر والبرد وبالجملة فعناصر هذا العالم السفلى خيرها ممتزج بشرها ولكن خيرها غالب ۔ (۱)

ہے، بیماریاں گو بہت ہیں، لیکن صحت کے اعتبار سے کم ہیں۔ تکلیفوں کے مقابلہ میں لذتیں زیادہ ہیں، آرام کے مقابلہ میں بلائیں کم ہیں، اس کی مثال آگ ہے، آگ میں بہت سے فائدے ہیں اور نقصانات بھی ہیں، لیکن فائدوں کے مقابلہ میں نقصانات کی کچھ حقیقت نہیں، بارش، ہوا، گرمی، سردی، سب کا یہی حال ہے۔ غرض عالم سفلی میں جس قدر عناصر ہیں ان میں نفع و نقصان دونوں ملے ہوئے ہیں، لیکن نفع کا پلہ بھاری ہے۔

تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ عالم سلسلۂ اسباب پر قائم ہے، سبب کے ساتھ مسبب کا وجود ضروری ہے، سلسلۂ اسباب خدا نے پیدا کیا ہے۔ انسان کا ارادہ اور خواہش بھی منجملہ اسباب کے ہے، اس بنا پر انسان اپنے افعال کا سبب اور خالق ہے، لیکن علت العلل ہونے کے لحاظ سے ان افعال کا خالق بھی خدا ہی ہے، انسان جو افعال کرتا ہے اور ان افعال کے جو لازمی نتائج ہیں، یعنی عذاب و ثواب وہ خود بخود اسی سلسلۂ اسباب کے بنا پر وجود میں آتے ہیں۔ انسان کی فطرت میں خدا نے برائی کا مادہ بھی رکھا ہے اور ایسا کرنا حکمت کا اقتضا تھا، ان اصول کے سمجھنے کے بعد تمام اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید نے اس بحث کو ہر پہلو کے لحاظ سے فیصل کر دیا ہے۔

(۱) شفاء العلیل ص ۲۸۰ ۔

یورپ اور قرآن کے عدیم الصحۃ ہونے کا دعویٰ

اخبار ناظر کے ایک آرٹیکل مورخہ ۲۵/ اپریل سنہ ۱۳ء میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے چند ایسے نہایت قدیم اجزا ہاتھ آگئے ہیں جو موجودہ قرآن شریف سے مختلف اسلوب ہیں اور جن کی صحت پر موجودہ قرآن سے زیادہ اعتبار کیا جاسکتا ہے۔ قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو سب سے بڑا طعنہ دیا تھا، وہ ان کا شیوہ تحریف تھا، جس کی بدولت توراۃ اور انجیل ہمیشہ تغیر و تبدیل سے مختلف قالب بدلتی رہیں اور جس کی بدولت آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ آسمانی صحائف صحت کے لحاظ سے مذہبی کتابوں کے ساتھ بھی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہیں یا نہیں؟

دشمن کے جواب کا سب سے آسان طریقہ برابر کا جواب ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ عیسائیوں نے قرآن مجید پر ہر طرح کے اعتراضات کیے یہاں تک کہ یورپ کے بہت سے مستشرقین کو قرآن مجید کی کمال بلاغت سے بھی انکار ہے۔ تاہم آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ موجودہ قرآن مجید کے سوا قرآن مجید کا کوئی اور بھی نسخہ ہے۔ جو اس قرآن سے مختلف ہے۔

مذکورہ الصدر آرٹیکل پر کچھ لکھنا قبل از وقت ہے۔ اس لیے کہ اس آرٹیکل میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی پریس چند روز میں یہ مسودات شائع کر دے گا۔ اس سے جب تک وہ مسودات شائع نہ ہو جائیں تفصیلی طور سے ان کے متعلق بحث نہیں ہو سکتی۔ شائع ہونے کے بعد آسانی سے یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ وہ

مسودات کس زمانہ کے ہیں؟ اور ان کی صحت پر کہاں تک اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ اعتبار کے کیا وجوہ ہیں؟ قدامت کی کیا شہادتیں ہیں؟ کس قسم کے خلاف ہیں؟ ان مسودات پر عیسائیوں کا دست تصرف کہاں تک پہنچا ہے؟

تاہم جس قدر اس تحریک کے متعلق ابھی سے بحث کی جا سکتی ہے اس کے لئے سب سے پہلے اس کے متعدد بیانات کا خلاصہ لکھ دینا چاہئے اور وہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ جو حصص قرآن مجید کے دستیاب ہوئے ہیں، ان پر علاوہ قرآن کے اور تحریریں بھی ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے کہ قدیم زمانہ میں جب سامان نوشت و خواند کمیاب تھے، تو اکثر پرانی قلمی کتابوں پر جو بے کار ہو جایا کرتی تھیں، دوسری ضروری تحریروں کا اندراج ہو جایا کرتا تھا اور اس طور پر ایک ہی وقت میں مختلف کتابیں موجود ہوتی تھیں، ناظر کی عبارت اگرچہ صاف نہیں ہے۔ لیکن اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کیمبرج کے مذکورہ اوراق میں تین مختلف کتابیں مختلف زمانہ کی لکھی ہوئی موجود ہیں ان میں سب سے قدیم تحریر جیسا کہ ناظر سے مستنبط ہوتا ہے۔ یونانی و انجیلیہ اور نرتی زیشں میری کی عبارات ہیں جو سریانی زبان میں ہیں، دوسری عبارت جو دراصل مذکورہ بالا تحریر کے بعد اور اس کے اوپر لکھی گئی ہے۔ قرآن شریف کی عبارت ہے، تیسری تحریر جو اس کے بعد کی ہے، وہ عیسائی مقدسین کی بعض تحریروں کا اقتباس ہے اور یہ عبارت بھی عربی زبان میں ہے، اس طور پر گویا ایک سطح پر تلے اوپر تین مختلف تحریریں موجود ہیں، جو ایک دوسرے کو کس قدر ڈھکے ہوئے ہیں اور اس طرح اوپر کی تحریر کی وجہ سے نیچے کی عبارت دھندلی پڑ گئی ہے۔

۲۔ ان مسودات کو ناظر ساتویں صدی کے آخر یا آٹھویں صدی کی ابتداء کا بتاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریر یعنی سریانی زبان کی دو کتابیں اس زمانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔

۳۔ تیسری تحریر یعنی عیسائی مقدسین کی عربی عبارت کے طرز تحریر کے متعلق عیسائی برٹش میوزیم کے ماہرین کی رائے ہے کہ وہ نویں صدی کی لکھی ہوئی ہے۔

۴۔ ڈاکٹر منگانا نے ثابت کیا ہے کہ اوراق مذکورہ تین یا زائد نقلوں سے حاصل کئے گئے ہیں۔ جن میں سے بعض ماخذ اس وقت سے پہلے کے ہیں، جب حضرت زید بن ثابتؓ نے مروجہ نسخہ قرآن کو ترتیب دیا تھا۔

۵۔ ڈاکٹر منگانا نے ۲۵ صفحے مطالعہ کئے ہیں اور ان میں کم از کم موجودہ قرآن سے ۹۰ اختلافات ملتے ہیں اور چار ایسی آیتیں ہیں جو موجودہ قرآن میں نہیں، لیکن ان صفحات میں ہیں۔

۶۔ ڈاکٹر منگانا کے نزدیک ان صفحات کا بیشتر حصہ زیدؓ کے مرتب کردہ قرآن سے ترقی یافتہ ہے، مثلاً قرآن میں جو آیت ہے (یا رسُکما خولہ) اس کے بجائے ان صفحات میں جو الفاظ ہیں، ان کا ترجمہ یہ ہے، جب کہ حرم کے گرد ہم تھکے۔"

بیانات مذکورہ بالا میں چند امور قابل لحاظ ہیں۔

۱۔ جن لوگوں نے یورپ کے پچھلے زمانہ کی تاریخ پڑھی ہے اور عیسائیوں کی حیرت انگیز تصنیفات کے وقتوں مطالعہ کئے ہیں جن کی تفصیلات پروفیسر ہنری دی کاستری (فرنچ مصنف) کی کتاب میں موجود ہیں، جس کا ترجمہ عربی زبان میں مصر سے شائع ہو چکا ہے، وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی کوئی مذہبی کتاب عیسائیوں کے ہاتھ میں آکر ہر قسم کی ناجائز کوششوں سے کہاں تک محفوظ رہ سکتی ہے، ہم نے وہ تحریریں دیکھی ہیں جن کی نسبت یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسائیوں کے لئے لکھی ہیں اور وہ بعینہٖ محفوظ ہیں، ان تحریروں کے فوٹو شائع کئے گئے ہیں اور ان کا اصلی ہونا عیسائیوں کی قدیم خانقاہوں یا گرجا میں بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے ایک تحریر بھی اصلی اور واقعی نہیں ہے اور فن حدیث کا معمولی صاحب مذاق بھی ان کے جعلی ہونے کو بیک نظر معلوم کر سکتا ہے، تاہم یورپ کے مستشرقین ان کو صحیح اور اصلی نوشتہ خیال کرتے ہیں۔

۲۔ جو آیت اختلاف کے ثبوت میں پیش کی ہے، افسوس ہے کہ اصل عربی عبارت نقل نہیں کی ہے، بلکہ اس کا ترجمہ لکھا ہے کہ "حرم کے گرد ہم تھکے" قرآن مجید

میں جو الفاظ ہیں اس کا ترجمہ یہ ہے "جس کو ہم نے برکت دی" اسی بنا پر ڈاکٹر منگانا یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ مفروضہ قرآن موجودہ قرآن سے مختلف ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر اصل عربی عبارت نقل کرتے تو ہم آسانی سے اس کی نسبت کوئی رائے قائم کر سکتے تھے۔ تاہم یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید میں "بارکنا" کا جو لفظ ہے اس کا ترجمہ غلط کیا ہے۔ قرآن مجید کی رسم خط میں "بارکنا" کا لفظ بغیر الف کے لکھا جاتا ہے یعنی "برکنا" قدیم زمانہ میں قرآن مجید پر زیر و زبر مد وغیرہ نہیں ہوتے تھے۔ زیر و زبر لکھنا حجاج بن یوسف کے زمانہ سے شروع ہوا ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ کسی قدیم نسخے میں "بارکنا" کا لفظ اس طرح پر لکھا ہو کہ اس پر الف ممدودہ نہ ہو اور اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اس کو "برکنا" پڑھا ہو جس کے معنی بیٹھنے اور ٹیکنے اور جھکنے کے ہو سکتے ہیں اور اسی بنا پر بجائے برکت کے اس کا ترجمہ جھکنا کر دیا۔

۵۔ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اوراق مذکورہ کا ماخذ حضرت زید بن ثابت کے زمانہ سے پہلے کا ہے۔ وہ اس کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کر سکتا ہے؟ کیا ان اوراق پر کتابت کی تاریخ لکھی ہے؟ کیا کاغذ کی شکل یا خط کی شان سے کتابت کا ٹھیک زمانہ متعین ہو سکتا ہے؟ کیا ڈاکٹر منگانا اور کوئی صاحب ان اصول شہادت کے معیار سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے پر آمادہ ہیں؟ ان تمام امور کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں اوراق مذکورہ کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہئے۔

قرآن مجید کی تدوین کی کیفیت

اس موقع پر ہم مختصر اور سادہ طور پر قرآن کے مرتب و مدون ہونے کے واقعات درج کرتے ہیں۔ جن سے اس مسئلہ پر روشنی پڑ سکتی ہے کہ ڈاکٹر منگانا کی تحقیق کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے؟

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا۔ تمام عرب میں اشعار اور خطبات کی زبانی محفوظ رکھنے کا عام رواج تھا۔ آج شعرائے جاہلیت کے بیسیوں دیوان موجود ہیں جو

ہو سے کے ابتدائی عہد تک مطلق قلمبند نہیں ہوئے تھے۔ (مثلاً دیوان امرء القیس، دیوان حسان بن ثابت، دیوان زہیر بن ابی سلمیٰ، دیوان نابغہ ذبیانی، دیوان علقمۃ الفحل، دیوان حاتم طائی وغیرہ) یہ تمام دیوان اسلام سے پہلے کے ہیں اور اسلام کے بعد بھی یہ ایک مدت تک درج تحریر نہیں ہوئے، سینکڑوں ہزاروں شخص ان کو زبانی محفوظ رکھتے تھے اور جب قلمبند ہوئے تو اس کی صحت کے ساتھ قلمبند ہوئے کہ بجز شاذ مثالوں کے اختلاف نسخ کی بھی نوبت نہیں آئی، جو قومیں لکھی پڑھی نہیں ہوتیں ان کے حافظے عموماً نسبتاً قوی ہوتے ہیں اور عرب اس خصوصیت میں تمام قوموں سے اور بھی زیادہ ممتاز تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو پہلے بہت چھوٹی چھوٹی سورتیں اتریں، جو لوگ اسلام کے حلقہ میں داخل ہوتے تھے ان کا پہلا کام قرآن مجید کی نازل شدہ آیتوں اور سورتوں کا محفوظ رکھنا ہوتا تھا، کثرت سے ایسے صحابہ تھے جن کو پورا قرآن محفوظ تھا، جنگ یمامہ میں جو صحابہ شہید ہوئے ان میں ستر ایسے تھے جن کو پورا قرآن مجید یاد تھا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے کہ میں نے ستر سورتیں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھیں۔

قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا سب سے بڑھ کر ثواب کا کام ہے، بخاری میں روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "تم میں وہ شخص رتبہ میں سب سے بڑھ کر ہے جو قرآن سیکھے یا سکھلائے" (۱) اس بنا پر ہر مسلمان نہایت اہتمام اور شوق سے قرآن مجید سیکھتا اور سکھلاتا تھا، حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے دس برس کی عمر میں سورۂ حجرات سے لے کر اخیر قرآن تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یاد کر لیا تھا۔

ایک غریب شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک عورت سے شادی کرنی چاہی، آپ نے دریافت فرمایا تمہارے پاس مہر میں دینے کے

(۱) بخاری ج ۲ ص ۷۵۲

سے لے کیا ہے؟ انھوں نے کہا کچھ نہیں، فرمایا تم کو کچھ قرآن زبانی یاد ہے، بولے ہاں فلاں فلاں سورتیں یاد ہیں، آپ نے فرمایا تو یہی سورتیں بجائے مہر کے ہیں اور میں اسی پر تمہارا نکاح پڑھائے دیتا ہوں۔ (۱)

غرض عرب کی قوت حافظہ، قرآن مجید کے یاد رکھنے کی فضیلت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب و تاکید، قرآن مجید کی عبارت کی دلآویزی، تعلیم قرآن کا اہتمام، یہ سب اسباب ایسے تھے جن کی وجہ سے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے زمانہ میں پورا قرآن مجید یا اس کا بڑا حصہ سینکڑوں اشخاص کو یاد تھا۔

---

(۱) صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۰ میں یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے۔

تحریر و کتابت

بااینہمہ صرف زبانی حفظ پر اکتفاء نہیں کیا گیا۔ بلکہ جب قرآن مجید نازل ہوتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو حکم دیتے تھے اور وہ قلمبند کرلیتے تھے لیکن عرب میں چونکہ لکھنے کا رواج اس وقت تک کم تھا۔ تاہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے قریش کے ۱۷ اشخاص اس فن کے ماہر تھے۔ ان میں چار خلفائے راشدین بھی تھے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ چلے آئے اور جنگ بدر میں قریش کے چند لکھے پڑھے آدمی (جو اس وقت تک کافر تھے) گرفتار ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ مدینہ میں لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں اور یہی ان کا زرفدیہ ہوگا۔ یعنی اس کے بعد وہ رہا کر دیئے جائیں گے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو مشہور کاتب وحی تھے اسی طریقہ سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا۔

بہرحال مدینہ منورہ میں لکھنا پڑھنا عام طور پر رائج ہوگیا۔ یہاں تک کہ حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے عبرانی اور لاطینی زبان بھی سیکھ لی۔ (۱)

اب تحریر کا اس قدر رواج ہوگیا تھا کہ قرآن مجید کے علاوہ بعض صحابہ (حضرت عبداللہ بن عمروؓ) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی قلمبند کرلیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ تمام صحابہ میں سب سے زیادہ کثیر الروایہ ہیں۔ لیکن بخاری میں ان کا قول مذکور ہے کہ عبداللہ بن عمروؓ مجھ سے زیادہ کثیر الروایہ ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ میں لکھتا نہ تھا اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر لکھ لیتے تھے۔

---

(۱) مسند احمد بن حنبل ج ۵ ص ۱۸۲

اسی وقت لکھ بھی لیا کرتے تھے۔(۱)

غرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں پورا قرآن مجید قلم بند ہو چکا تھا البتہ کسی ایک مجموعہ میں جمع نہیں ہوا تھا اور سورتوں میں باہم کوئی ترتیب قرار نہیں پائی تھی۔ لیکن ہر سورہ کی تمام آیتیں مرتب قلم بند ہو چکی تھیں۔ قرآن مجید کے مدون اور مرتب ہونے کی تاریخ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب غزوۂ یمامہ میں اکثر حفاظ قرآن نے شہادت پائی تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ قرآن جمع کرا دیجئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے زید بن ثابتؓ کو جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں کتابت وحی کا کام کیا کرتے تھے، بلا کر یہ خدمت سپرد کی۔ حضرت زیدؓ نے غایت اہتمام سے اس کام کو انجام دیا۔ جہاں جہاں تحریری اجزاء تھے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر مہیا کئے۔ یہاں تک کہ ہڈیوں، پتھر کے ٹکڑوں اور کھجور کے تختوں پر لکھے ہوئے اجزاء بہم پہنچائے۔ یہ التزام کیا کہ تحریر کے ساتھ زبانی شہادت بھی لیتے تھے۔ یعنی وہ تحریری عبارت لوگوں کو زبانی بھی یاد ہے یا نہیں؟ اس طرح پورا قرآن مجید مرتب ہوا اور سورتوں کی ترتیب ان کے نازل ہونے کے زمانہ کے لحاظ سے نہیں رکھی بلکہ زیادہ تر سورتوں کے طول و مختصر ہونے کا لحاظ رکھا۔ یعنی بڑی سورتیں پہلے رکھی گئیں، متوسط ان کے بعد اور مختصر سب سے اخیر۔ یہ نسخہ حضرت حفصہؓ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حرم محترم اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کے گھر میں رکھوا دیا گیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب قرآن مجید کی کثرت سے نقلیں شائع ہونے لگیں تو اختلاف نسخ پیدا ہوا۔ اس بنا پر حضرت حفصہؓ کے مکان سے وہ نسخہ منگوا کر متعدد نقلیں کرائیں اور اسلام کے بڑے بڑے صوبوں میں بھجوا دیں کہ تمام نسخے ان کے مطابق نقل کئے جائیں۔ حضرت عثمانؓ نے یہ بھی حکم دیا جیسا کہ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں۔

وارسل الی کل افق بمصحف مما نسخوا و امر بما سواہ من القرآن | اور جو نسخے تیار ہوئے وہ ہر افق (صوبہ جات) میں بھجوا دئے، اور حکم دیا کہ ان کے سوا کسی

(۱) اتقان ج ۱ ص ۲۲

فی کل صحیفۃ او مصحف ان یحرق۔ (۱) صحیفے میں جو لکھا ہو وہ جلا دیا جائے۔

واقعات مذکورہ سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قرآن مجید تو در آنحضرت کے زمانہ میں بہت سے صحابہ کو زبانی یاد تھا۔

۲۔ قرآن مجید کا ایک جملہ بھی ایسا باقی نہیں رہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قلمبند نہ کرلیا گیا ہو۔

۳۔ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کے اہتمام سے قرآن مجید کا جو نسخہ مرتب کرایا وہ تحریری نوشتوں سے مرتب ہوا تھا جس کی تصدیق ان لوگوں سے بھی کرائی جاتی تھی جو قرآن مجید کے کلاً یا جزاً حافظ تھے۔

۴۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تمام سورتیں مرتب ہو چکی تھیں اور ان کے الگ الگ نام قائم ہو چکے تھے۔ البتہ سورتوں میں باہم تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے ترتیب نہیں دی گئی تھی، یہ ترتیب حضرت زید بن ثابتؓ نے قائم کی۔

۵۔ جو نسخے ایسے تھے جن میں کاتبوں کی غلطی سے کچھ تغیر ہو گیا تھا، حضرت عثمانؓ نے سب کو جلوا دیا۔

نتائج مذکورہ کے بعد اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر منگانا جن نسخوں کو حضرت زیدؓ اور حضرت عثمانؓ سے پہلے کا بتاتے ہیں، ان کی صحت کے کیا دلائل پیش کر سکتے ہیں؟ جب یہ ثابت ہے کہ حضرت زیدؓ نے انتہائی تفحص، اہتمام و تلاش اور تمام صحابہؓ کی حفظ کوششوں سے مدون کیا تھا، جب یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمانؓ نے وہ تمام مصاحف ضائع کر دئے جو حضرت زید بن ثابتؓ کے نسخوں کے مطابق نہ تھے جب کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف ابتداء سے آج تک بہ تواتر محفوظ چلا آیا تو کیا ایک۔ ڈاکٹر منگانا کا بلا دلیل احتیاط تمام عظیم الشان شہادتوں کے مقابلہ میں ایک ذرہ بھی وقعت رکھتا ہے۔

ہم نے اس مضمون کو نہایت اختصار کے ساتھ لکھا ہے جب کیمبرج پریس اپنے کاغذات شائع کرے گا، اس وقت ہم اسکو بتادیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا۔

(۱) صحیح بخاری باب جمع القرآن ج ۲ ص ۷۴۶

مسائل فقہیہ پر زمانہ کی ضرورتوں کا اثر

ہمارے مخالفوں نے سینکڑوں بار کہا ہے اور اب بھی کہتے ہیں کہ اسلام کا قانون (مسائل فقہیہ) دست شل ہے، جس کو کسی طرح جنبش نہیں ہو سکتی، یعنی اس میں ترقی کی کوئی گنجائش نہیں اور اس وجہ سے وہ کسی طرح زمانہ کی ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

ہم اس کے متعلق اگر کچھ کہنا چاہتے ہیں تو مخالفین کہتے ہیں کہ یہ آج کل کے خیالات کا اثر ہے، ورنہ قدمائے اسلام کے نزدیک مسائل فقہیہ میں کسی اصلاح اور تغیر کی گنجائش نہیں، اس بنا پر ہم اس کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتے، بلکہ یہ دکھاتے ہیں کہ سلف نے خود اس مضمون پر کیا لکھا ہے۔

فقہائے متاخرین میں سے علامہ شامی کو جو شہرت اور حسن قبول حاصل ہوا، کم کسی کو ہوا ہوگا، انہوں نے خود اس بحث پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف ہے، یہ رسالہ اور بہت سے رسائل کے ساتھ ۱۳۰۲ھ میں بمقام دمشق میں چھپ گیا ہے، اس رسالہ میں علامہ موصوف نے نہایت تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے، ہم اس کے بعض بعض مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

اعلم ان المسائل الفقهية اما ان تكون ثابتة بصريح نص وهي الفصل الاول	جاننا چاہئے کہ مسائل فقہیہ یا صریح نص سے ثابت ہوں گے ان مسائل کو ہم نے

وإما أن تكون ثابتة بضرب اجتهاد ورأي وكثير منها ما يبينه المجتهد على ما كان في عرف زمانه بحيث لو كان في زمان العرف الحادث لقال بخلاف ما قاله اولا ولهذا قالوا في شروط الاجتهاد انه لا بد فيه من معرفة عادات الناس فكثير من الاحكام تختلف باختلاف الزمان لتغير عرف اهله او لحدوث ضرورة او فساد اهل الزمان بحيث لو بقي الحكم على ما كان عليه اولا للزم منه المشقة والضرر بالناس ولخالف قواعد الشريعة المبنية على التخفيف والتيسير ودفع الضرر والفساد لبقاء العالم على اتم نظام واحسن احكام ولهذا ترى مشايخ المذهب خالفوا ما نص عليه المجتهد في مواضع كثيرة بناها على ما كان في زمانه لعلمهم بانه لو كان في زمنهم لقال بما قالوا به (۱)

پہلی فصل میں بیان کیا۔ یا اجتہاد اور رائے سے ثابت ہوں گے۔ ان میں سے اکثر مسائل ایسے ہوتے ہیں۔ جن کو مجتہد نے اپنے زمانے کے رواج کے موافق قائم کیا تھا اس طرح کہ اگر وہ (یعنی مجتہد) آج کے زمانے میں موجود ہوتا تو اپنے ہی قول کے خلاف کہتا۔ اسی بنا پر اجتہاد کے شرائط میں لوگوں نے اسکو بھی داخل کیا ہے کہ مجتہد لوگوں کے رسم و رواج سے واقفیت رکھتا ہو کیونکہ اکثر احکام زمانہ کے اختلاف سے بدل جاتے ہیں۔ بوجہ اسکے کہ رواج بدل گیا یا کوئی نئی ضرورت پیدا ہوگئی یا زمانہ کے لوگ بدروش ہوگئے اس صورت میں اگر وہ پہلا حکم باقی رہے تو اس سے لوگوں کو تکلیف اور ضرر پہنچے اور شریعت کے ان قواعد کی مخالفت لازم آئے۔ جن کی بنیاد آسانی اور دفع ضرر پر ہے تاکہ دنیا نہایت اعلیٰ درجہ کے نظم و نسق پر قائم رہے۔ اسی بنا پر تم دیکھتے ہو کہ مشائخ فقہ نے اکثر موقعوں پر مجتہد کی تصریحات سے اختلاف کیا ہے۔ جن کی بنیاد مجتہد کے زمانہ کے حالات کے موافق تھی۔ کیونکہ مشائخ کو یہ معلوم ہے کہ اگر آج خود مجتہد موجود ہوتا تو وہی کہتا جو انھوں نے کہا۔

(۱) رسالہ مذکور ص [illegible]

اس کے بعد مصنف نے بہت سی مثالیں دی ہیں، جس میں زمانہ کی رسم و عادت کی وجہ سے احکام بدل گئے، ان میں سے چند یہ ہیں۔

پہلے مجتہدین کا یہ فتویٰ تھا کہ قرآن مجید کی تعلیم پر معاوضہ لینا جائز نہیں، اب فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب تھا کہ گواہ کا ظاہر میں ثقہ ہونا کافی ہے، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے ظاہری عدالت کو ناکافی قرار دیا۔ کیونکہ امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں اکثر لوگ ثقہ اور عادل ہوتے تھے، اس لئے ظاہری عدالت کافی تھی، لیکن پھر وہ حالت نہیں رہی۔

پہلے وصی کو یتیم کے مال میں مضاربت کا حق حاصل تھا، متاخرین نے اس کو ناجائز قرار دیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں عورتیں مسجد میں نماز کے لئے حاضر ہوتی تھیں۔ متاخرین نے منع کر دیا۔

مزارعت، معاملت، وقف میں امام ابو حنیفہؒ کا قول معمول بہ نہیں ہے، بلکہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے قول پر فتویٰ ہے۔

بیع بالوفاء پہلے ناجائز تھی، پھر جائز قرار دے دی گئی۔

اس قسم کی قریباً سو مثالیں مصنف نے پیش کی ہیں، جن میں زمانہ کے اختلاف حالت کی وجہ سے احکام فقہی بدل گئے ہیں۔

اس کے بعد مصنف نے یہ سوال قائم کیا ہے کہ اب اس زمانہ میں احکام کا بدلنا جائز ہے یا نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں۔

فان قلت العرف یتغیر و یختلف باختلاف الزمان فلو طرء عرف جدید هل للمفتی فی زماننا ان یفتی علی وفقه و یخالف المنصوص و کذا هل للحاکم الآن العمل بالقرائن قلت مبنی هذه الرسالة علی هذه المسئلة فاعلم

اگر تم یہ کہو کہ رواج تو زمانہ کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے تو اب اگر کوئی نیا رواج پیدا ہو تو ہمارے زمانہ کے مفتی کو اس کے موافق فتویٰ دینا اور منصوصات کی مخالفت کرنا جائز ہے یا نہیں؟ اور اسی طرح کیا حاکم وقت کو قرائن پر عمل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو میں کہتا ہوں کہ اس رسالے

ان المتأخرين الذين خالفوا المنصوص في كتب المذهب في المسائل السابقة لم يخالفوه الا لتغير الزمان والعرف وعلمهم ان صاحب المذهب لو كان في زمنهم لقال بما قالوا ـ

کی بنیاد یہی مسئلہ ہے۔ یہ سمجھنا چاہئے کہ متاخرین نے ان تصریحات سے جو اگلی کتابوں میں تھیں اختلاف جو کیا، اس بنا پر کیا کہ اب زمانہ اور رواج بدل گیا ہے اور اگر آج خود قدما موجود ہوتے تو وہی کہتے جو ہم کہتے ہیں۔

علامہ موصوف نے ایک اور رسالے میں جس کا نام شرح المنظومہ ہے، اس مسئلہ کو صراحتاً لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

وفي القنية ليس للمفتي ولا للقاضي ان يحكما على ظاهر المذهب ويتركا العرف انتهى ونقله منها في خزانة الروايات وهذا صريح فيما قلنا من ان المفتي لا يفتي بخلاف عرف اهل زمانه ـ

اور قنیہ میں مذکور ہے کہ مفتی اور قاضی کو یہ جائز نہیں کہ ظاہر مذہب پر حکم دے اور اس کتاب سے خزانۃ الروایات میں یہ قول نقل کیا ہے اور یہ صریح ہمارے اس قول کے موافق ہے کہ مفتی کو اپنے زمانے کے رواج کے خلاف حکم نہیں دینا چاہئے۔

یہاں فوراً یہ شبہ پیدا ہوگا کہ اگر شریعت کے احکام زمانے کے اختلاف سے بدل سکتے ہیں تو اس کی حد کیا قرار پائے گی، یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے خود فرائض تک پہنچ سکتا ہے، کیونکہ زمانے کے اختلاف سے فرائض اور ارکان بھی بدل سکتے ہیں۔ یہ شبہ علامہ شامی نے اپنے رسالے میں ذکر کرکے جواب دیا ہے۔

فنقول في جواب هذا الاشكال اعلم ان العرف نوعان خاص وعام وكل منهما اما ان يوافق الدليل الشرعي والمنصوص عليه في كتب ظاهر الرواية اولا فان وافقهما فلا كلام والا فاما ان يخالف الدليل

تو ہم اس اعتراض کے جواب میں کہتے ہیں کہ عرف کی دو قسمیں ہیں، خاص اور عام اور ان دونوں کی بھی دو صورتیں ہیں، یا تصریحات ظاہر الروایۃ (یعنی امام محمد کی تصانیف ستہ) کے موافق ہوں گی یا نہیں، اگر موافق ہو تو کچھ پوچھنا ہی نہیں اور اگر

الشرعی او المنصوص علیه فی المذهب فنذکر ذلک فی بابین الباب الاول اذا خالف العرف الدلیل الشرعی فان خالفه من کل وجه بان لزم منه ترک النص فلا شک فی رده کتعارف الناس کثیرا من المحرمات من الربا و شرب الخمر و لبس الحریر و الذهب و غیر ذلک مما ورد تحریمه نصا و ان لم یخالفه من کل وجه بان ورد الدلیل عاما و العرف خالفه فی بعض افراده او کان الدلیل قیاسا فان العرف معتبر ان کان عاما فان العرف العام یصلح مخصصا کما مر عن التحریر و یترک به القیاس۔ الخ

مخالف ہو تو ہم اس کو دو بابوں میں لکھتے ہیں۔ پہلا باب جب کہ رواج دلیل شرعی کے مخالف ہو۔ اس صورت میں اگر ہر طرح سے دلیل شرعی کے مخالف ہو، جس سے نص شریعت کا ترک کرنا لازم آئے تو اس کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں مثلاً اکثر لوگوں نے بہت سے محرمات کا معمول کر لیا ہے۔ مثلاً شراب، سود، حریر اور زری کا استعمال جن کی حرمت صاف نص میں آئی ہے اور اگر کلیۃً نص صریح کا مخالف نہ ہو مثلاً یہ کہ دلیل عام ہو اور رواج ایک خاص صورت سے متعلق ہو۔ یا یہ کہ دلیل کوئی نص نہ ہو، بلکہ قیاس ہو تو اس صورت میں رواج کا اعتبار کیا جائے۔ بشرطیکہ رواج عام ہو اور اس صورت میں رواج، دلیل شرعی کا مخصص واقع ہو سکے گا۔ جیسا کہ تحریر (ایک کتاب کا نام ہے) کے حوالہ سے گذر چکا ہے اور رواج عام کے مقابلہ میں قیاس ترک کر دیا جائے گا۔

علامہ موصوف نے اس مسئلہ کو ایک جزئی صورت میں بتایا ہے۔ وہ یہ کہ مثلاً حدیث میں وارد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس شرط پر آٹا پیسنے کو دے کہ اجرت کے بدلے تہائی آٹا اس کا ہوگا تو ناجائز ہے۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ مثلاً اگر کوئی شخص کسی جولاہے کو اس شرط پر سوت دے کہ وہ اس کا کپڑا بن دے اور اجرت کے معاوضہ میں ایک تہائی کپڑا لے لے تو یہ معاملہ ناجائز ہوگا۔ لیکن چونکہ بلخ میں یہ طریقہ عموماً معمول ہے۔ اس لئے بلخ کے فقہاء نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور یہ

قرار دیا کہ رواج کی بنا پر حدیث میں تخصیص کر دی جائے گی۔ یعنی حدیث صرف آنے کی صورت تک محدود رہے گی۔ علامہ کے الفاظ ہیں:

و مشایخ بلخ کنصیر بن یحیی و محمد بن سلمة و غیرهما کانوا یجیزون هذه الاجارة فی الثیاب لتعامل اهل بلدهم و التعامل حجة یترک به القیاس و یخص به الاثر۔

اور بلخ کے اکثر مشائخ مثلاً نصیر بن یحییٰ و محمد بن سلمہ وغیرہ اس معاملہ کو کپڑے میں جائز قرار دیتے تھے، کیونکہ ان کے شہر میں یہ عام رواج تھا اور رواج کے مقابلہ میں قیاس ترک کر دیا جاتا ہے اور حدیث میں تخصیص کر لی جاتی ہے۔

ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ فقہ اسلامی میں ترقی اور اقتضائے ضروریات کی موافقت کی قابلیت نہیں۔ آج کل معاملات کے متعلق سینکڑوں ہزاروں جزئیات جو پیدا ہو گئے ہیں، ان کو اگر جائز یا حرام کہا جاتا ہے تو اس بنا پر کہ ان کو کسی قدیم کلیہ کے تحت میں داخل کر لیا جاتا ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ یہ جزئیات اس زمانے میں موجود نہ تھے۔ لیکن علامہ شامی نے سینکڑوں روایتوں کی اسناد سے ثابت کر دیا ہے کہ عام رواج کی بنا پر کلیات کا حکم خاص کر دیا جاتا ہے۔

وقف اولاد

وقف اولاد کی تحریک جو اخباروں کے ذریعہ سے عام طور پر مشتہر ہو چکی ہے، اگرچہ اس کی نسبت تمام ملک میں نہایت سرگرمی اور جوش سے موافقت اور تائید کی صدا اٹھی، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ شریعت اسلامی کا کیا مسئلہ تھا؟ حکام پریوی کونسل نے اس کو کیونکر باطل کیا؟ اور کس غلط فہمی کی بنا پر باطل کیا؟ اس کے متعلق اب کیا کوشش ہو رہی ہے؟ اور کس حد تک ہو چکی ہے؟ اور آئندہ کیا کیا کرنا ہے؟

اصل یہ ہے کہ شریعت اسلام کا ایک یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائداد کو خدا کی راہ میں فقراء اور غرباء کے لئے اس طرح مخصوص کر دے کہ اصل جائداد ہمیشہ محفوظ رہے گی اور اس کا منافع فقراء و غرباء کو ملتا رہے گا تو اس معاملہ کا نام وقف ہوگا اور وہ جائداد ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ یعنی نہ فروخت ہو سکے گی نہ ہبہ ہو سکے گی، نہ وارثوں کو وراثت میں مل سکے گی۔ البتہ اس کا منافع فقراء کو ملتا رہے گا۔

وقف کی یہ صورت تمام اور مذہبوں میں بھی موجود ہے، لیکن تمام اور مذاہب نے وقف کو غریبوں اور بے کسوں کے لئے محدود رکھا ہے۔

لیکن اسلام نے اس کو اور وسعت دی ہے، اسلام نے یہ قرار دیا کہ اپنی آپ مدد کرنا، اپنی آل اور اولاد کی پرورش کرنا، انسان کا اصلی فرض ہے اور ایسا فرض ہے جس کے ادا کرنے پر انسان کو ثواب حاصل ہوتا ہے، اس بنا پر اسلام نے وقف کو اولاد اور اعزہ تک وسعت دی، یعنی اگر کوئی شخص صرف اپنی اولاد پر کوئی جائداد وقف کرے تو یہ وقف بھی جائز اور نافذ ہوگا، لیکن جب موقوفہ جائدادوں کے متعلق وارثوں

میں نزاعیں پیدا ہوئیں اور مقدمات انگریزی عدالتوں میں گئے تو حکام انگریزی نے وقف کو ناجائز قرار دیا۔ کیوں کہ انگریزی خیرات (چیریٹی) کا لفظ فقرا اور بے کسوں کے لئے مخصوص ہے۔ اپنی اولاد کو کچھ دینا خیرات میں داخل نہیں۔ حکام انگریزی کے سامنے وکلاء نے فقہ اسلام کی متعدد روایتیں پیش کیں، لیکن انھوں نے اس پر اصرار کیا کہ خیرات کے معنی وہی لئے جائیں گے جو انگریزی قانون میں ہیں۔ چنانچہ جسٹس ٹریولین نے ایک مقدمہ کے فیصلہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں (۱)

میں لفظ خیرات کو انگریزی لفظ چیرٹی کا مفہوم سمجھتا ہوں اور اس مفہوم کے موافق انگریزی عدالتوں میں اور انگریزی ترجموں میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ مجھ سے چاہا جاتا ہے کہ میں لفظ خیرات کے مفہوم کو مسلمانوں کے موافق سمجھوں۔ یعنی ایک دوسری زبان کا لفظ استعمال کروں جس کا مفہوم اس زبان کے مفہوم کے خلاف ہو۔

اس کے بعد کثرت سے مقدمات دائر ہوئے، لیکن حکام نے اپنی رائے سے تجاوز نہ کیا۔ ایک مقدمہ میں جو از طرف میر محمد اسماعیل خاں بنام غلام چراغ محمد تھا، مولوی امیر صاحب جج بھی شریک فیصلہ تھے۔ انھوں نے نہایت مستند حوالوں سے اس مسئلہ کو ثابت کیا۔ یہ مقدمہ پریوی کونسل تک گیا۔ لیکن حکام پریوی کونسل نے وقف کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر متعدد مقدمات پریوی کونسل تک گئے اور حکام اسی اپنی رائے پر قائم رہے۔ سب سے زیادہ مفصل اور مدلل فیصلہ اس باب میں وہ ہے جو حکام نے بمقدمہ ابو الفتح محمد اسحاق بنام رسمیا چودھری ۲۲ نومبر ۱۸۹۴ء کو صادر کیا اور جو انڈین لا رپورٹ جلد ۲۲ صفحہ ۷۶ میں درج ہے۔

اس فیصلہ کا اقتباس ہم اس غرض سے لکھتے ہیں کہ یہ معلوم ہو کہ حکام پریوی کونسل نے کس بنا پر وقف اولاد کو ناجائز قرار دیا ہے۔ حکام کے نزدیک وقف اولاد کے ناجائز ہونے کے وجوہ ذیل ہیں۔

۱۔ اپنی اولاد پر وقف کرنا کوئی ایثار نفس اور فیاضی نہیں ہے۔ اولاد کو دینا گویا

(۱) انڈین لا رپورٹ ج ۲ کلکتہ از ص ۲۰۶

جائداد کو خود اپنے ہاتھ میں رکھنا اور حفاظت جائداد کا بندوبست ہے۔ چنانچہ حکام پریوی کونسل مقدمہ مذکور میں لکھتے ہیں :

"یہ خیال کرنا مقنن اعظم (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت بیجا ہوگا کہ مقنن موصوف نے اس کے ذریعہ سے ایسے ہبہ جات کو پسند کیا ہے۔ جن کے ذریعہ سے واہب نے کچھ نفس کشی نہ کی ہو۔ جس میں وہ ایک ہاتھ سے اس شے کو واپس دیتا ہے، جو بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے ہاتھ سے دی اور جو ذریعہ جمع کرنے اور ازدیاد جائداد اور خاندان ہیں"۔

۲۔ شریعت اسلام میں ہبہ مشروط ناجائز ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یوں ہبہ کرے کہ میری جائداد فلاں شخص کو ملے اس شرط پر کہ وہ اس کو منتقل نہ کرسکے گا۔ پھر اس کے مرنے پر اس کی اولاد کو ملے گی۔ لیکن اسی شرط پر کہ وہ اس کو منتقل نہ کرسکے گا اور اسی طرح یہ ہبہ اولاد در اولاد تک قائم رہے گا تو یہ ہبہ ناجائز ہوگا۔ جب اس قسم کا ہبہ ناجائز ہے تو وقف کی بھی یہی صورت ہے۔ وہ کیوں کر جائز ہوگا۔ حکام پریوی کونسل کے الفاظ یہ ہیں :

"حکام مدوح نے تنازعہ بحث میں دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ از روئے عام قانون اسلام کے نقل درجہ جیسا کہ ہند میں معلوم ہے سادہ ہبہ جات حق جانب مسلسل اشخاص کے بہ حق اولاد بعید جو ہنوز نہیں پیدا ہوئی۔ یعنی متواتر ناقابل انتقال حقوق حین حیاتی ممنوع ہیں۔ آیا یہ تصور کرنا چاہئے کہ وہی انتقالات جو اس صورت میں ناجائز ہیں۔ جب کہ معمولی الفاظ ہبہ کے استعمال کئے جائیں جائز ہو جاتے ہیں، اگر ہبہ کنندہ صرف یہ کہدے کہ وہ بطور وقف کے خدا کے نام پر غرباء کے لئے کئے گئے۔ ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ نہ جواب دینے کی کوشش کی گئی۔ نہ حکام عالی مقام کو کوئی جواب معلوم ہوتا ہے" (۱)

مولوی امیر علی صاحب جج نے نہایت مفصل اور مستند طریقہ سے وقف اولاد

(۱) مقدمہ ابو الفتح محمد اسحاق صفحہ انگریزی ۳۱۲

کو ثابت کیا، انھوں نے وہ تمام حدیثیں نقل کیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
نے فرمایا ہے کہ اپنی اولاد کو دینا بھی صدقہ اور خیرات کرنا ہے، لیکن حکام پریوی کونسل
کہتے ہیں کہ اس قسم کی حدیثیں اخلاقی باتیں ہیں، جو مناسب موقعوں پر کہی جاتی ہیں،
لیکن یہ کوئی قانون اور فقہی مسئلہ نہیں بن سکتا۔ حکام موصوف کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

"حکام عالی مقام نے تا حد اپنی بہترین لیاقت کے، متعلق اور متعلق کرنے
اس شرع محمدی کے کوشش کی، جو حد تک معلوم ہے اور جس پر وہاں عمل کیا جاتا ہے،
لیکن ممدوح کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ قطعی اور [جیسا کہ حکام ممدوح کو معلوم ہوتا ہے]
بیجا متعلق کرنا حد بطلانے اصول کا جو نبی کے منہ سے نکلیں مطابق اس قانون کے
ہے، ممکن ہے کہ یہ حدیثیں مناسب موقعوں پر نہایت عمدہ ہوں۔" (۱)

مولوی امیر علی صاحب نے وقف اولاد کی جو مثالیں خود آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے زمانہ میں عمل میں آئی تھیں، اپنے فیصلہ میں
پیش کیں لیکن حکام پریوی کونسل نے ان کو کافی نہ سمجھا۔ حکام کے اصلی الفاظ یہ ہیں:

"نسبت تعامل کے حکام عالی مقام کو بہت زیادہ مفصل حالت معلوم ہونے
کا نہیں، قبل اس کے کہ وہ تصریح کر سکیں کہ آیا وہ متعلق بھی ہوں گے یا نہیں، حکام
ممدوح سمجھتے ہیں کہ ہبہ کیا گیا (۲) اور وہ بحال رکھا گیا۔ لیکن بابت حالت جائداد کے،
اس کے سوا اور کچھ انھوں نے نہیں جانا کہ مقدسہ مقولہ میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکان مذکور
خاص طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا، ان کو کچھ حال خاندان یا وقف کا معلوم نہیں۔" (۳)

حاصل یہ کہ حکام پریوی کونسل کی اور انگلش قوم کی کسی طرح سمجھ میں
نہیں آ سکتا کہ خود اپنی اولاد کو دینا ثواب اور خیرات کا کام کیونکر ہو سکتا ہے اور
جب وہ خیرات نہیں تو وقف کیونکر ہو سکتا ہے۔

خان بہادر مولوی محمد یوسف صاحب وکیل کلکتہ نے اس بارہ میں نہایت

---

(۱) مقدمہ ابو الفتح محمد اسحاق صفحہ انگریزی ۵۵ (۲) وقف کو ہبہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے

(۳) مقدمہ ابو الفتح محمد اسحاق صفحہ انگریزی ۵۵

کافی تدبیر کوشش کی۔ انھوں نے ایک مطول رسالہ انگریزی زبان میں لکھا اور بحیثیت پریسیڈنٹ محمڈن ایسوسی ایشن بنگال وائسرائے کی خدمت میں بھیجا۔ لیکن اولاً تو رسالہ نہایت طول طویل اور حشو و زوائد پر مشتمل تھا اور ایک ہی مضمون کا بار بار اعادہ کیا گیا تھا۔

ثانیاً وہ رسالہ پیش ایسے طریقہ سے کیا گیا کہ بجز محمڈن ایسوسی ایشن کے ہندوستان کی اسلامی جماعت اور اخبارات کو خبر تک نہ ہوئی۔

ثالثاً یہ قاعدہ مقررہ ہے کہ پریوی کونسل اپنے کسی فیصلہ کو منسوخ نہیں کرتی نہ اس کے فیصلہ میں وائسرائے اور گورنمنٹ کوئی مداخلت کر سکتی۔

غرض وجوہ مذکورہ بالا سے ناکامی ہوئی۔

اب ہم کو کیا کرنا چاہیے

۱۔ ایک وقف ایسوسی ایشن یعنی وقف کی ایک کمیٹی قائم ہو جس کے ممبر تمام اضلاع ہندوستان کے سربرآوردہ مسلمان، تعلقہ دار، زمیندار، عہدہ داران سرکاری، وکلاء، وغیرہ وغیرہ ہوں۔

۲۔ ایک فتویٰ تمام ہندوستان کے علماء کے دستخط سے مزین ہو کر تیار کرا دیا جائے۔

۳۔ ایک رسالہ لکھا جائے جس میں احادیث اور روایات فقہیہ سے وقف اولاد کو ثابت کیا جائے۔

۴۔ ایک عرض داشت مرتب ہو کر تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے اس پر دستخط کرائے جائیں اور وہ مع رسالہ و فتویٰ مذکورہ بالا کے حضور وائسرائے کی خدمت میں بھیجی جائے، جس کا مضمون یہ ہو کہ۔

تمام مسلمانان ہندوستان اس تعبیر کو خلاف قانون اسلام سمجھتے ہیں جو پریوی کونسل نے وقف اولاد کے مسئلہ میں کی ہے، اس لئے ہم مسلمانوں کی درخواست ہے کہ گورنمنٹ ایک جدید قانون وقف اولاد کے متعلق حسب شریعت اسلام بنا دے، جیسا کہ ہندو بیوگان کی نسبت حضور وائسرائے نے ہندؤں کی درخواست پر ایک قانون

موسومہ قانون نکاح بیوگان بنا دیا ہے۔

غرض جب تک تمام مسلمانوں کی متفقہ آواز سے گورنمنٹ پر یہ نہ ثابت ہو گا کہ پریوی کونسل کا فیصلہ۔ مسلمانوں کے مذہب اور شریعت کے خلاف ہے۔ اس بارے میں کچھ کامیابی نہیں ہو سکتی۔

رسالہ کا مسودہ الندوہ (۱) میں اطلاع عام کے لئے شائع کیا جاتا ہے اور اس پر جو حضرات کسی قسم کی رائے دینا چاہیں، مفاکسار کو تحریر فرمائیں۔ یہ رسالہ تمام علماء کی خدمت میں منظوری کے لئے مرسل ہو گا اور ان کے دستخط اس پر ثبت کرائے جائیں گے۔

چونکہ انگریزی عدالتوں نے بالعموم وقف علی الاولاد کو جو شریعت اسلام کا ایک مسلم مسئلہ ہے۔ متعدد فیصلوں کے ذریعہ سے ناجائز اور باطل قرار دے دیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ خود اسلامی شریعت میں یہ مسئلہ ناجائز ہے۔ اس لئے یہ رسالہ تحریر کیا جاتا ہے۔ جس سے دو امر ظاہر کرنا مقصود ہے۔

۱۔ اولاد پر جائداد کا وقف کرنا۔ حدیث اور فقہ دونوں سے ثابت ہے اور مسلمانوں کے تمام فرقے اس میں متفق الرائے ہیں۔

۲۔ حکام انگریزی بالخصوص پریوی کونسل نے کس بنا پر اس مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔

وقف اولاد کا مسئلہ اصول مفصلہ ذیل پر مبنی ہے۔

پہلا اصول۔ شریعت اسلامی میں خیرات اور صدقہ۔ غیروں پر محدود نہیں بلکہ خود اپنے اہل و عیال کو دینا بھی صدقہ اور خیرات (نیکی) ہے۔

قرآن مجید میں ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ	یہ نیکی نہیں ہے کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرو۔ لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر اور قیامت پر اور فرشتوں پر

(۱) رسالہ الندوہ نمبر ۳ ج ۲ ص ۱۲ ۱۹۰۵ء

وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ (البقرۃ ۲: ۱۷۷)

اور کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور خدا کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافر کو اور سائل کو اور آزاد کرنے کے لئے دے۔

ایک اور آیت میں ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (البقرۃ ۲: ۲۱۵)

لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خیرات کریں۔ کہہ دے کہ جو خیرات کرو تو والدین کو اور رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور مسکینوں کو اور مسافروں کو۔

قرآن مجید کی یہ آیت جب نازل ہوئی۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (آل عمران ۳: ۹۲)

تم ثواب نہیں پاسکتے جب تک اس چیز میں سے خیرات نہ کرو جو تم کو محبوب ہے۔

تو ابو طلحہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) خدا کہتا ہے کہ جب تک محبوب چیز خیرات نہ کرو نیکی نہ ملے گی تو مجھ کو اپنی تمام جائدادوں میں سے بیرحا بہت زیادہ محبوب ہے۔ میں اس کو صدقہ دینا چاہتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تو بہتر یہ ہے کہ اپنے عزیزوں پر صدقہ کرو۔ چنانچہ ابوطلحہؓ نے یہ جائداد اپنے اقارب اور قوم میں اپنے چچا زاد بھائیوں پر صدقہ کی۔ یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے جو قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ مستند کتاب ہے۔ اصل الفاظ بخاری کے یہ ہیں۔

قال انس فلما نزلت لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون قام ابو طلحۃ فقال یا رسول اللہ

انس کا بیان ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ تم کو ثواب نہ حاصل ہوگا، جب تک تم اپنا محبوب مال خیرات نہ کرو تو ابو طلحہؓ کھڑے

ان اللّٰہ یقول لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ وان احب اموالی الی بیرحاء وانہا صدقۃ للّٰہ ارجو برھا وذخرھا عند اللّٰہ فضعہا حیث اراک اللّٰہ فقال بخ ذلک مال رابح او رایح شک ابن مسلمۃ وقد سمعت ما قلت ۔ وانی اری ان تجعلہا فی الاقربین (۱)

ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ! خدا یہ کہتا ہے اور مجھ کو سب سے زیادہ عزیز میری بیرحاء کی جائداد ہے تو وہ خدا کی راہ میں صدقہ ہے۔ میں اس کے ثواب کا اور خدا کے ہاں ذخیرہ ہونے کا امیدوار ہوں تو آپ جس طرح چاہئے صرف کیجئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سبحان اللہ یہ تو بکار آمد جائداد ہے (یا چلتی ہوئی چیز ہے) ابن مسلمۃ کو شک ہے کہ ان دو لفظوں میں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا فرمایا تھا۔ میں نے سنا جو تم نے کہا اور میری رائے ہے کہ تم اس جائداد کو عزیزوں پر وقف کردو۔

صحیح مسلم میں ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم دینار انفقتہ فی سبیل اللّٰہ و دینار انفقتہ فی رقبۃ ودینار تصدقت بہ علی مسکین و دینار انفقتہ علی اھلک اعظمہا اجر الذی انفقتہ علی اھلک (۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو روپیہ تم نے خدا کی راہ میں صرف کیا اور کسی گرفتار کے چھڑانے میں صرف کیا اور جو مسکین پر صرف کیا اور جو اپنی بیوی بچوں پر صرف کیا، ان میں خدا کے ہاں سب سے زیادہ جس پر اجر ملے گا، وہ وہ ہے جو بال بچوں پر تم نے صرف کیا۔

صحیح بخاری میں ہے۔

خیر الصدقۃ ما کان عن ظہر

اچھی خیرات وہ ہے جو اہل وعیال کے

---

(۱) بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الزکوٰۃ علی الاقارب ج ۱ ص ۹۸ (۲) صحیح مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل النفقۃ علی العیال والمملوک ج ۱ ص ۳۲۲

غنی و ایسر ، بحسن تحول (۱) — غریب سے توری ہو کر کی جائے اور شروع عیال سے کرو۔

بخاری و مسلم میں ہے۔

عن ام سلمۃ قالت قلت یا رسول اللہ انی اجر ان انفق علی بنی ابی سلمۃ انما ھم بنی فقال انفقی علیھم فلک اجر ما انفقت علیھم (۲)

ام سلمہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ اگر میں ابو سلمہ کے بچوں پر صرف کروں تو کیا مجھ کو ثواب ملے گا - وہ تو میرے بیٹے ہی ہیں۔ آپ نے فرمایا ہاں (۱) ان پر صرف کرو۔ تم کو اس کا ثواب ملے گا۔

بخاری اور مسلم میں ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی زینب کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے بی بیو خیرات دو گو اپنے زیور ہی سے سہی۔ یہ سن کر میں اپنے شوہر کے پاس گئی اور کہا کہ تم مفلس آدمی ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو خیرات کرنے کا حکم دیا ہے تو تم جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کہ تم کو دینا خیرات میں داخل ہے یا نہیں؟ اگر نہ ہو تو میں اوروں کو خیرات دوں، عبداللہ نے کہا نہیں تم ہی جاؤ۔ زینب گئیں۔ اتفاق سے دروازہ پر ایک اور بیوی ملیں اور ان کو بھی یہی پوچھنا تھا۔ اتنے میں بلالؓ باہر نکلے، ہم نے بلالؓ سے کہا جا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو کہ دو عورتیں یہ پوچھ رہی ہیں کہ اگر وہ اپنے شوہر کو اور یتیموں کو جو ان کے زیر تربیت ہیں خیرات دیں تو یہ خیرات میں داخل ہوگا یا نہیں۔ زینب نے یہ بھی کہدیا کہ ہمارا نام نہ بتانا۔ بلالؓ نے جا کر پوچھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کا نام پوچھا۔ بلالؓ نے کہا ایک زینب ہیں اور ایک انصاری عورت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کون سی زینب؟ بلالؓ نے کہا عبداللہ کی بیوی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

(۱) بخاری کتاب الزکوٰۃ باب لا صدقۃ الا عن ظہر غنی ج ۱ ص ۱۹۲ (۲) مسلم کتاب الزکوٰۃ باب فضل النفقۃ ج ۱ ص ۳۲۳ و بخاری کتاب الزکوٰۃ باب الزکوٰۃ علی الزوج و الایتام ج ۱ ص ۱۹۸

فرمایا ان کو دو ثواب ہوں گے، ایک رشتہ کا اور ایک خیرات کا۔ (یہ صحیح مسلم کے الفاظ کا ترجمہ ہے) (۱)

صحیح ترمذی اور ابن ماجہ اور نسائی میں ہے۔

الصدقة على المسكين صدقة وهي على ذي الرحم ثنتان صدقة و صلة (۲)	مسکین کو صدقہ دینا صرف صدقہ ہے اور قرابت دار کو دینا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحم بھی۔

بخاری اور مسلم میں ہے۔

اذا انفق المسلم نفقة على اهله وهو يحتسبها كانت له صدقة (۳)	جب مسلمان اپنے بال بچوں پر صرف کرتا ہے اور ثواب کچھ کر کرتا ہے تو وہ خیرات ہے۔

ان تمام احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا یہ اصول ہے کہ خیرات اور صدقہ جس طرح غیر لوگوں کو دینا ثواب ہے، اسی طرح اپنی اولاد عزیز اور اقارب کو دینا بھی ثواب ہے، اسلام کا اصول یہ ہے کہ اپنے بال بچے بھی عام سوسائٹی کے افراد ہیں، اس لئے ان کی مدد کرنا بھی بنی نوع انسان کی مدد کرنا ہے اور اس لئے ثواب ہے، انگریزی میں بھی مثل ہے کہ خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے۔

دوسرا اصول اسلام نے خیرات کے دو طریقے قرار دیے ہیں، ایک یہ کہ اصل چیز خیرات میں دے دی جائے، دوسرے یہ کہ اصل چیز محفوظ رہے اور اس کا منافع یا آمدنی خیرات میں صرف ہوتی رہے، اس دوسری قسم کا نام وقف ہے۔

وقف کا یہ حکم ہے کہ اصل شے نہ کسی کی ملک ہو سکتی نہ فروخت ہو سکتی

(۱) مسلم کتاب الزکوة باب فضل النفقة و الصدقة على الاقربين ج ۱ ص ۳۲۰ و بخاری حوالہ مذکور (۲) ترمذی ابواب الزکوة باب ما جاء فی الصدقة على ذي القرابة ج ۱ ص ۱۳۷ و نسائی کتاب الزکوة باب الصدقة على الاقارب ج ۱ ص ۳۶۰ ابن ماجہ باب فضل الصدقة ص ۱۳۳ (۳) مسلم کتاب الزکوة باب فضل النفقة على الاقربين ج ۱ ص ۳۲۱

نہ منتقل ہو سکتی۔ وقف کی حقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرما دی تھی۔ حضرت عمرؓ کو خیبر میں ایک نخلستان ہاتھ آیا۔ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں خیرات کرنا چاہتا ہوں۔ کس طریقہ سے کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اصل محفوظ رہے۔ یعنی نہ بک سکے، نہ ہبہ ہو سکے، نہ اس میں وراثت جاری ہو۔

یہ واقعہ بخاری میں متعدد طریقوں سے بالتفصیل مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں:۔

تصدق باصله لا يباع ولا يوهب ولا يورث ولكن ينفق ثمره (۱)	اصل کو اس طرح خیرات میں دو کہ وہ نہ بک سکے نہ ہبہ کی جا سکے نہ اس میں وراثت جاری ہو، بلکہ اس کا پھل لوگوں کو ملا کرے۔

اگرچہ یہ وقف، غرباء اور مسافروں اور مہمانوں وغیرہ کے لئے مخصوص تھا، تاہم رشتہ دار اور قرابت دار بھی اس میں داخل تھے۔ چنانچہ بخاری کے یہ الفاظ ہیں:۔

في الفقراء والقربىٰ وفي الرقاب وفي سبيل الله والضيف وابن السبيل (۲)

تیسرا اصول۔ فقہ اسلام کا تمام تر مدار نیت پر ہے۔ یعنی ایک ہی چیز کسی شخص کو دوستی یا ہبہ کی نیت سے دی جائے تو اس کے اور احکام ہوں گے اور اگر یہ نیت کرلی جائے کہ خدا کی راہ میں دی گئی تو اس کے احکام بالکل بدل جائیں گے، مثلاً ایسی چیز کا دینا سیدوں اور دولت مندوں کو ناجائز ہوگا، حالانکہ ہبہ کرنا ہر شخص کے لئے جائز ہے۔

وقف کا مسئلہ انھیں اصول مذکورہ بالا کی بنیاد پر ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس قسم کے وقفوں کی بنیاد پڑی اور اس وقت

(۱) بخاری کتاب الوصایا باب الوقف ج ۱ ص ۳۸۹ (۲) بخاری کتاب الوصایا باب الوقف ج ۱ ص ۳۸۹

سے آج تک یہ سلسلہ برابر قائم رہا۔

صحابہؓ نے اولاد پر وقف کیا تھا

فتح القدیر حاشیہ ہدایہ میں یہ سند نقل کیا ہے

ان الزبیر بن العوام وقف دارہ علی المردودۃ من بناتہ

زبیر بن عوامؓ نے اپنا ایک مکان اپنی مطلقہ لڑکیوں پر وقف کیا۔

فتح القدیر (۱) میں حاکم کی سند سے روایت ہے کہ ابتدائے اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جس مکان میں رہتے تھے اور جو صفا کے پاس تھا۔ اس کو اس کے مالک ارقم نے اپنے بیٹوں پر وقف کر دیا تھا۔ وقف نامہ کے الفاظ یہ تھے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ھذا ما قضی الارقم ..... لا تباع ولا تورث (۲)

یہ وہ وقف ہے جو ارقم نے قائم کیا ...... وہ نہ بیچا جائے گا نہ اس میں وراثت جاری ہوگی۔

اسی فتح القدیر میں بیہقی کی کتاب الخلافیات سے نقل کیا ہے۔

تصدق ابو بکر بدارہ بمکۃ علی ولدہ فھی الی الیوم ... وتصدق سعد بن ابی وقاص بدارہ بالمدینۃ وبدارہ بمصر علی ولدہ فذالک الی الیوم ... وعمرو بن العاص بربط من الطائف ودارہ بمکۃ والمدینۃ علی ولدہ فذالک الی الیوم (۳)

حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے مکان کو جو مکہ میں تھا، اپنی اولاد پر وقف کیا، چنانچہ وہ اب تک قائم ہے۔۔۔۔ سعد بن ابی وقاصؓ نے اپنے مدینہ کے مکان کو اور مصر کے مکان کو اپنے بیٹوں پر وقف کیا جو اب تک قائم ہے۔۔۔۔ عمرو بن العاصؓ نے طائف اور مکہ اور مدینہ کے مکانات کو وقف کیا، چنانچہ وہ اب تک قائم ہے۔

---

(۱) فتح القدیر ہدایہ کی شرح ہے اور نہایت معتبر کتاب ہے (۲) فتح القدیر کتاب الوقف ج ۵ ص ۴۸ مطبعہ المجاز [illegible] (۳) یہ سب عبارتیں فتح القدیر ج ۵ ص ۴۸ مطبع نول کشور لکھنؤ میں ہیں

عینی شرح ہدایہ میں ہے۔

وفي الخلافيات للبيهقي قال ابو بكر عبد الله بن الزبير الحميدي تصدق ابو بكر بداره بمكة علي ولده فهي الي اليوم وتصدق عمر بربعة عند المروة بالاته علي ولده فهي الي اليوم وتصدق علي رضي الله عنه بارضه وداره بمصر وباموا له بالمدينة علي ولده فذالك الي اليوم وتصدق سعد بن ابي وقاص رضي الله عنه بربعة عند المروة وبداره بالمدينة وبداره بمصر علي ولده فذالك الي اليوم (۱)

بیہقی نے خلافیات میں لکھا ہے کہ ابوبکر عبداللہ بن الزبیر حمیدی نے کہا کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے مکان کو جو مکہ میں تھا، اپنے بیٹوں پر صدقہ کیا اور وہ اب تک ہے اور حضرت عمرؓ نے ایک جائداد کو جو مروہ میں تھی مع آلات کے اپنے بیٹوں پر وقف کیا۔ سو وہ اب تک ہے اور حضرت علیؓ نے مصر کے مکان اور اراضی اور مدینہ کی جائداد کو اپنی اولاد پر وقف کیا جو اب تک موجود ہے اور سعدؓ بن ابی وقاص نے مروہ کے پاس ایک جائداد کو اور مدینہ اور مصر کے مکانات کو اپنی اولاد پر وقف کیا تو وہ اب تک قائم ہے۔

صحیح بخاری میں ہے، باب الوقف میں۔

وتصدق الزبير بدوره وقال للمردودة من بناتي ان تسكن۔ وجعل ابن عمر نصيبه من دار عمر رضي الله تعالي عنه مسكني لذوي الحاجة من آل عبد الله (۲)

اور زبیرؓ نے اپنے مکانات اپنی ان لڑکیوں پر وقف کئے جو مطلقہ ہوں۔ اور عبداللہ بن عمرؓ نے اپنا وہ حصہ جو حضرت عمرؓ کی جائداد سے ملا تھا۔ اپنی محتاج اولاد پر وقف کیا۔

جن بزرگوں نے یہ وقف کئے تھے یعنی (راقم)، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عمرو بن العاصؓ، زبیرؓ، حضرت علیؓ، عبداللہ بن عمرؓ

(۱) عینی شرح ہدایہ ج ۵ ص ۹۱۹ مطبوعہ لکھنؤ (۲) بخاری کتاب الوصایا باب اذا وقف ارضا او بئرا الخ

یہ سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور اصحاب ہیں۔ تعجب ہے کہ باوجود اس کے حکام پریوی کونسل [۱] کہتے ہیں کہ جو نظائر پیش کئے گئے ہیں، وہ مبہم اور زیادہ تفتیش طلب ہیں اور ہم کو ان وقف کرنے والوں کا حال معلوم نہیں۔ جن بزرگوں کے نام اوپر گذرے، اسلام کی تاریخ میں ان سے زیادہ کوئی نام آور نہیں۔ جو جائدادیں وقف کیں ان کے موقعے اور پتے بتا دئے گئے ہیں اور چوتھی صدی ہجری تک کے محدثین نے لکھا ہے کہ آج تک یہ اوقاف قائم ہیں۔

فقہ میں وقف اولاد اسی بنا پر فقہ میں اولاد کا خاص باب ہے اور اس کے متعلق ہر قسم کے تفصیلی احکام درج ہیں۔

فتاویٰ قاضی خاں میں جو نہایت معتبر کتاب فقہ حنفی کی ہے، لکھا ہے۔

رجل قال ارضی ھذہ صدقۃ موقوفۃ علی ولدی کانت الغلۃ لولد صلبہ یستوی فیہ الذکر و الانثی ... و اذا اجاز ھذا الوقف فما دام یوجد واحد من ولد الصلب کانت الغلۃ لہ لا غیر وان لم یبق واحد من البطن الاول یصرف الغلۃ الی الفقراء [۲]

ایک شخص نے کہا میری یہ زمین میری اولاد پر صدقہ اور وقف ہے تو زمین کا حاصل صلبی اولاد کو ملے گا، اس میں مرد عورت سب برابر ہوں گے ... اور جب یہ وقف جائز ہوا تو جب تک ایک شخص بھی صلبی اولاد سے موجود رہے گا منافع اسی کو ملے گا اور کسی کو نہیں اور اگر پہلی پشت کا کوئی شخص موجود نہ رہ جائے تو فقیروں کو ملے گا۔

فتاویٰ عالمگیری باب الوقف میں ہے۔

وان قال علی ولدی و ولد ولدی و ولد ولد ولدی فذکر البطن الثالث فانہ یصرف

اور اگر کہا کہ جائداد میری اولاد اور اولاد اولاد اور ان کی اولاد اولاد یعنی تیسری پشت کا بھی ذکر کیا تو جائداد کا منافع ہمیشہ خاندان کو

(۱) اس فیصلہ پر پریوی کونسل کا حوالہ آگے آتا ہے۔ (۲) فتاویٰ قاضی خاں فصل فی الوقف علی الاولاد ج ۲ ص ۱۹۱ مطبوعہ مطبع العلوم لکھنؤ

الغلۃ الی اولادہ ابدا ما تناسلوا ولا یصرف الی الفقراء ما بقی احد یکون الوقف علیهم وعلی من اسفل منهم الاقرب والا بعد فیه سواء (۱)	تمام رہے گا جب اولاد کی نسل چلتی رہے اور فقیروں کو کچھ نہیں ملے گا جب تک خاندان میں ایک شخص بھی باقی رہے گا اس کو اور اس کے نیچے والوں کو منافع ملے گا۔ قریب اور بعید سب اس میں برابر ہوں گے۔

در مختار میں ہے۔

ولو زاد البطن الثالث عم نسله ویستوی الاقرب والابعد (۲)	اور اگر تیسری پشت کو بھی اضافہ کیا تو تمام نسل کو عام ہوگا۔ قریب و بعید سب شامل ہوں گے۔

چونکہ یہ مسئلہ بلا اختلاف تمام فقہاء نے تصریحاً لکھا ہے اس لئے زیادہ عبارتیں ہم نے نقل نہیں کیں۔

مفتی بہ قاضی ابو یوسف اور امام محمد کی رائے ہے	اس موقع پر بطور ایک واقعہ کے یہ ظاہر کر دینا بھی ضرور ہے کہ وقف کے احکام جو بیان

ہوئے وہ قاضی ابو یوسف اور امام محمدؒ اور تمام دیگر فقہاء کی رائے کے موافق ہیں امام ابو حنیفہؒ سرے سے وقف کے قائل نہیں یعنی ان کے نزدیک وقف میں واقف کی ملکیت ساقط نہیں ہوتی اور واقف جب چاہے وقف سے رجوع کر سکتا ہے۔ لیکن تمام فقہاء نے تصریح کی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ نہیں ہے۔ بلکہ قاضی ابو یوسف صاحب اور امام محمدؒ صاحب کے قول پر فتویٰ ہے۔

فتاوائے عالمگیری میں ہے۔

وفی العیون والیتیمة ان الفتوی علی قولهما (۳)	اور عیون اور یتیمہ (کتابوں کا نام ہے) میں ہے کہ فتویٰ دونوں صاحبوں (قاضی ابو یوسف و امام محمدؒ) کے قول پر ہے۔

(۱) کتاب الوقف عالمگیری الفصل الثانی فی الوقف علی نفسه و اولاده و نسله ج ۲ ص ۴۹ (۲) الدر المختار کتاب الوقف فصل فیما یتعلق بوقف الاولاد ص ۳۳۹ مطبع ہاشمی میرٹھ (۳) فتاویٰ عالمگیری کتاب الوقف ج ۲ ص ۳

فتاویٰ قاضی خان میں ہے۔

والناس لم یأخذوا بقول ابی حنیفة فی هذا للآثار المشهورة عن رسول الله صلی الله علیه وسلم والصحابة (۱)

اور لوگوں نے اس بارہ میں ابو حنیفہؒ کے قول کو اختیار نہیں کیا بوجہ ان مشہور روایتوں کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے مروی ہیں۔

در مختار میں ہے۔

فلا یجوز له ابطاله ولا یورث عنه وعلیه الفتوی (۲)

تو وقف کرنے والے کو وقف کا باطل کرنا جائز نہیں اور نہ شے موقوفہ میں وراثت جاری ہو سکتی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

فتح القدیر حاشیہ ہدایہ میں ہے۔

والحق ترجیح قول عامة العلماء بلزومه لان الاحادیث والآثار متظافرة علی ذلک قولا کما صح من قوله علیه الصلوة والسلام لا یباع ولا یورث الخ وتکرر هذا فی احادیث کثیرة واستمر عمل الامة من الصحابة والتابعین ومن بعدهم علی ذلک اولها صدقة رسول الله ثم صدقة ابی بکر ثم عمر وعثمان

اور حق یہ ہے کہ عام علماء جو وقف کے لازم ہونے کے قائل ہیں، انہی کے قول کو ترجیح ہے کیونکہ حدیثیں اور روایتیں اس میں پے در پے ہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول صحیح طور سے ثابت ہے کہ جائداد موقوفہ نہ فروخت ہو سکے گی نہ اس میں وراثت جاری ہوگی اور متعدد حدیثوں میں بیان آیا ہے اور تمام امت محمدیؐ کا صحابہ سے لے کر تابعین اور مابعد کے لوگوں کا اسی پر عمل رہا۔ پہلا وقف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔ پھر ابو بکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ،

(۱) فتاویٰ قاضی خان کتاب الوقف ج ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۲ (۲) در مختار کتاب الوقف ص ۳۳۹

وعلی والزبیر ومعاذ بن جبل وزید بن ثابت وعائشه واسماء واختها وام سلمه وام حبیبه و صفیه بنت حیی وسعد بن ابی وقاص وخالد بن الولید وجابر بن عبدالله وعقبه بن عامر ابی اروی الدوسی وعبدالله بن الزبیر رضی الله عنهم کل هولاء من الصحابة ثم التابعین بعدهم کلها بروایات وتوارث الناس اجمعون ذلک (۱)

زبیرؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، عائشہؓ اور ان کی بہن اسماءؓ اور ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ اور صفیہؓ بنت حیی اور سعد بن ابی وقاصؓ اور خالد بن الولیدؓ اور جابر بن عبداللہؓ اور عقبہ بن عامرؓ اور ابی اروی الدوسیؓ اور عبداللہ بن الزبیرؓ ان سب نے وقف کیا، یہ سب لوگ صحابہ میں ہیں اور ان کے مابعد کے لوگوں کا یہ عمل رہا اور تمام لوگ اس کو کرتے آئے ہیں۔

بحرالرائق شرح کنزالدقائق مصنفہ علامہ ابن نجیم میں ہے۔

وقد اکثر الخصاف من الاستدلال لهما بوقوف النبی صلی الله علیه وسلم واصحابه رضی الله عنهم وقد کان ابو یوسف مع الامام حتی حج مع الرشید ورای وقوف الصحابة رضی الله عنهم بالمدینة ونواحیها فرجع وافتی بلزومه ولقد استبعد محمد قول ابی حنیفة فی الکتاب لهذا وسماه تحکما علی الناس (۲)

اور خصاف نے قاضی ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذہب کے موافق بہت سے وقفوں سے استدلال کیا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہؓ نے وقف کئے۔ پہلے قاضی ابو یوسفؒ بھی امام ابو حنیفہؒ کے ہم خیال تھے، لیکن جب انھوں نے ہارون الرشید کے ساتھ حج کیا اور مدینہ میں جاکر وہاں اور اسکے اطراف میں صحابہ کے اوقاف دیکھے تو انکی رائے بدل گئی اور فتویٰ دیا کہ وقف لازم ہے اور امام محمدؒ نے اپنی کتاب میں امام ابو حنیفہؒ کے قول پر بہت تعجب کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ زبردستی ہے۔

(۱) فتح القدیر ج ۵ ص ۴۲۰ (۲) بحر الرائق کتاب الوقف ج ۵ ص ۱۸۷ مطبوعہ مصر

پریوی کونسل کے شبہات کا جواب

اصول ہائے مذکورہ بالا کے بیان کرنے کے بعد ہم پریوی کونسل کے ان شبہات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جن کی بنا پر انہوں نے وقف اولاد کو ناجائز سمجھا ہے۔

جناب مولوی امیر علی صاحب جسٹس نے اپنے فیصلہ مندرجہ انڈین لا رپورٹ سلسلہ کلکتہ جلد ۲۰ صفحہ ۱۰۰ میں متعدد روایتیں وقف اولاد کے جائز ہونے کے متعلق نقل کی تھیں۔ لیکن حکام پریوی کونسل نے ان کے متعلق یہ لکھا ہے۔

رائے اس مقنن ذی علم شرع محمدی کی ہے کہ حکام عالی مقام سمجھتے ہیں ایسے اقوال پر مبنی ہے جو اصول وضعی تھے اور ایسے نظائر پر جو بہت غیر مکمل طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ مثلاً حاکم موصوف نے حوالہ ایک نصیحت خود پیغمبر علیہ السلام کا دیا ہے، جس کا یہ مضمون ہے کہ نیکی کی راہ سے دینا اپنے خاندان کو اس غرض سے کہ وہ محتاج نہ ہوں زیادہ تر کار ثواب بہ نسبت فقراء کے ہے۔ نہایت اعلیٰ صدقہ وہ ہے کہ جو کوئی شخص اپنے خاندان کو دے۔ اور بطور نظیر کے حاکم موصوف نے ذکر ہے ایک مکان کا کیا ہے کہ جو وقف یا صدقہ میں دے دیا گیا تھا اور جس کی آمدنی [illegible] واہب کو عطا کی گئی تھی۔ حاکم موصوف کی دیگر قدیم اسناد اسی قسم کی ہیں۔

نسبت نظائر کے حکام عالی مقام کو بہت زیادہ مفصل حالات معلوم ہونے چاہئیں، قبل اس کے کہ وہ یہ تجویز کر سکیں کہ آیا وہ متعلق بھی ہوں گے یا نہیں۔ حکام صدر ملتے ہیں کہ ہبہ کیا گیا اور وہ بحال رکھا گیا۔ لیکن بابت حالات جائداد کے سوا اس کے اور کچھ انہوں نے نہیں سنا کہ متعدد قول میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکان مذکور خاص طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا، ان کو کچھ حال خاندان یا واقف کا معلوم نہیں۔

نسبت ان حدیثوں کے جو بطور اصلی اصول شرع محمدی کے بیان کی گئی ہیں، واضح ہو کہ حکام عالی مقام نے یہ امر فراموش نہیں کیا کہ کس حد تک شرع اور مذہب

بالکل مختلف ہیں۔ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ شریعت اسلام میں احکام کا مدار نیت پر ہے۔ اگر ایک شخص کوئی چیز کو ہبہ دینا چاہے تو بہ کسی قید کے دے سکتا ہے۔ لیکن اگر اس کا نام وہ زکوٰۃ رکھ دے جو خیرات کی ایک قسم ہے تو بہت سی شرطیں لازم ہوجائیں گی۔ مثلاً یہ کہ جس کو وہ چیز دی جائے وہ دولت مند نہ ہو۔ پیغمبر کے خاندان سے نہ ہو۔ کمانے کرنے کے قابل نہ ہو۔

فقہ اسلام میں ہبہ اس کا نام ہے کہ کوئی چیز کسی شخص کو قطعاً دے دی جائے کہ وہ جو چاہے کرے۔ اس صورت میں چونکہ یہ احتمال ہے کہ موہوب لہ اس کو جائز یا ناجائز طور پر بالکل صرف کر ڈالے اور اس سے کوئی مستقل اور مستمر مدد کسی کو حاصل نہ ہو۔ اس لئے یہ کوئی ثواب کا کام نہیں قرار دیا گیا۔ بخلاف اس کے وقف کے یہ معنی ہیں کہ مستقل اور مستمر طور پر ایک گروہ کی پرورش اور بقائے زندگی کا سامان کیا جائے۔ اس طرح کہ یہ ذریعہ معاش کوئی شخص منقطع نہ کرنے پائے۔ اس لئے ایسی تدبیر جس سے ایک گروہ انسانی کی پرورش کا ایک مستقل اور پائدار سلسلہ قائم ہو اور باقی رہے۔ یقیناً بنی نوع انسان کی بھلائی کا کام ہے اور داخل ثواب ہے۔

وقف میں موقوف لہ بہت سے شرائط کا پابند ہے۔ وہ جائداد کو منتقل نہیں کرسکتا۔ جائداد کے منافع کو بیجا نہیں صرف کرسکتا۔ جو مصرف وقف میں متعین ہو چکے ہیں۔ ان میں ادل بدل اور تغیر نہیں کرسکتا اگر موقوف لہ وقف کا بیجا استعمال کرے تو ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ عدالت میں اس پر دعویٰ کرے اور قاضی اس کو تمام ایسے تصرفات سے باز رکھے گا۔

اس صورت میں یہ ظاہر ہے کہ ہبہ اور وقف بالکل مختلف چیزیں ہیں اور ان کے احکام میں فرق کا ہونا لازمی ہے۔

جب تمام مذکورہ بالا حدیثوں اور فقہی روایتوں سے ثابت ہوگیا کہ اسلام میں اولاد پر وقف کرنا جائز اور واجب التعامل ہے تو پریوی کونسل کو اسلام ہی کے مطابق وقف کے مسئلہ پر عمل کرنا چاہئے۔ کیونکہ گورنمنٹ انگریزی کا یہ اصول ہے کہ وہ کسی قوم کے مذہبی احکام میں کوئی مداخلت نہیں کرتی۔

پردہ اور اسلام

یورپ کی نامبارک تقلید نے ملک میں جو نئے مباحث پیدا کردیئے ہیں، ان میں ایک یہ مسئلہ بھی ہے۔ اگر اس مسئلہ پر صرف عقلی پہلو سے بحث کی جاتی تو ہم کو دخل در معقولات کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ خود مذہب اسلام میں پردہ کا حکم نہیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ قرون اولیٰ میں پردہ کا رواج بھی نہ تھا۔ نئے تعلیم یافتہ گروہ کے سب سے مشہور اور مستند مصنف (مولوی امیر علی) نے ۱۸۹۹ء میں رسالہ نائن ٹینتھ سنچری میں مسلمان عورتوں کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جس میں وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "یہ لمبا برقع، حجاب اور خمار سلجوقیوں کے آخری زمانہ میں شائع ہوا اور جس قسم کا پردہ آج کل مسلمانان ہند میں رائج ہے، خلفاء کے زمانہ میں اس کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ بلکہ برعکس اس کے اعلیٰ طبقہ کی عورتیں بلا برقع کے مردوں کے سامنے آتی تھیں۔ ساتویں صدی ہجری کے وسط میں جب خلفاء ضعیف ہوئے اور تاتاریوں نے اسلامی حکومت کو درہم برہم کیا تو اس وقت علماء میں اس پر نزاع ہوئی کہ عورتیں اپنے ہاتھ منہ اور پاؤں اجنبیوں کے سامنے کھول سکتی ہیں یا نہیں۔"

اس موقع پر عبرت کے قابل یہ امر ہے کہ اسلام کی تاریخ اور اسلام کے مسائل کی تعبیر کرنے والے دو گروہ ہوسکتے تھے۔ علمائے قدیم اور جدید تعلیم یافتہ۔ علماء کا یہ حال ہے کہ ان کو زمانہ کی موجودہ زبان میں بولنا نہیں آتا۔ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے سبلغ علم کا اس عبارت سے اندازہ ہوسکتا ہے، جو ابھی اوپر گذر چکی۔ لیکن بد قسمتی سے یہی دوسرا گروہ قومی لٹریچر پر قبضہ کرتا جاتا ہے اور چونکہ غیر قوموں کے کانوں میں صرف اسی گروہ کی آواز پہنچتی ہے، اس لئے مسائل اور تاریخ اسلام کے متعلق آئندہ زمانہ میں

اسی گروہ کی آواز اسلام کی آواز سمجھی جاتی تھی، ہم اس مضمون میں صرف تاریخی پہلو سے بحث کرتے ہیں، اور یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ عرب میں اسلام سے پہلے پردہ کی کیا حالت تھی، پھر تمام اسلامی دنیا میں پردہ کے متعلق کیا طریق عمل رہا۔

مدت ہوئی ہم نے اس مضمون کے پہلے حصے پر ایک بسیط مضمون لکھا تھا، پہلے اس کو بعینہ اس مقام پر درج کرتے ہیں۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قدرت نے مرد اور عورت کو بعض خصوصیتوں میں ایک دوسرے سے ممتاز پیدا کیا ہے۔ لیکن تمدن نے ان قدرتی خصوصیتوں کے علاوہ اور بھی بہت سے امتیاز قائم کر دئے ہیں، جو ہر قوم، ہر فرقہ، ہر ملک میں جدا جدا صورتوں میں نظر آتے ہیں۔ دنیا کے نہایت ابتدائی زمانہ میں غالباً مردوں اور عورتوں کے لباس، وضع، طور طریقے بالکل یکساں رہے ہوں گے اور بجز قدرتی خصوصیتوں کے کوئی چیز ان کو ایک دوسرے سے جدا نہ کر سکتی ہوگی۔ لیکن تمدن کو جس قدر وسعت ہوتی گئی، اسی قدر یہ باہمی امتیازات بڑھ گئے۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ آج دونوں کے طریق تمدن اور معاشرت میں بہت کم چیزیں باقی رہ گئی ہیں جو مشترک کہی جا سکتی ہیں۔

دنیا کی ابتدائی تاریخ بالکل تاریکی کی حالت میں ہے۔ قدیم سے قدیم زمانہ جس کے تاریخی حالات معلوم ہو سکتے ہیں، دو تین ہزار برس سے زیادہ نہیں، یہ وہ زمانہ ہے، جب موجودہ تفرقوں کی بنیاد پڑ چکی تھی اور دونوں فریق کے اصول زندگی میں بہت سی ممتاز خصوصیتیں پیدا ہو چکی تھیں، اس لئے آج یہ پتہ لگانا قریباً نا ممکن ہے کہ اول کن اسباب سے یہ تفرقے قائم ہوئے اور جس زمانہ کو ہم اپنے علم تاریخ کی ابتداء قرار دیتے ہیں اس وقت تک کیونکر ان تفرقوں نے وسعت حاصل کر لی تھی۔

اگر ہم بتانا چاہیں کہ انسان کو ستر عورت کا خیال کیونکر ہوا اور مردوں اور عورتوں میں اس کے مختلف حدود کس بنا پر قرار دئے گئے تو ہم کوئی کافی وجہ نہیں بتا سکیں گے، اسی طرح اور خصوصیتوں کی نسبت بھی ہم کچھ جواب نہیں دے سکتے اس لئے نہایت

قدیم تفرقوں کی تاریخ قائم کرتی اور ان کے وجوہ و اسباب پر غور کرتا تو یہ فائدہ بہت اہم ہوتا جو امور زمانہ مابعد میں پیدا ہوئے ان کے متعلق تحقیقات کی کوشش کرتی۔ یا نہیں ہے۔

پردہ کی دو قسمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔

۱۔ چہرہ اور تمام اعضاء کا ڈھکنا۔

۲۔ مردوں کی مجلسوں اور صحبتوں میں شریک ہونا۔

پہلی قسم کا پردہ عرب میں اسلام سے پہلے موجود تھا اور زیادہ تر قدرتی ضرورتیں اس کے ایجاد کا باعث تھیں۔ اول اول جب اس رسم کی ابتداء ہوئی تو عورتوں کے ساتھ مخصوص نہ تھی۔ کیونکہ زیادہ تر اس کو قدرتی ضرورتوں نے پیدا کیا تھا اور وہ مرد اور عورت سے یکساں متعلق تھیں۔ غالباً سب سے پہلے قبیلۂ حمیر میں جو یمن کے رہنے والے اور وہاں کے حاکم تھے یہ طریقہ جاری ہوا۔ اسپین میں حمیر کے ایک خاندان کی حکومت قائم ہو گئی تھی۔ جو ملثمین کہلاتے تھے۔ اس خاندان نے نہایت زور اور قوت کے ساتھ حکومت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ لیکن چہرہ پر ہمیشہ نقاب ڈالے رہتے تھے اور اسی وجہ سے ملثمین کہلاتے تھے۔ اس میں یوسف بن تاشفین بڑی ہیبت و جبروت کا بادشاہ ہوا۔ علامہ ابن خلکان نے اسی کے ترجمہ میں اس رسم کے قائم ہونے کی وجہ لکھی ہے۔

وسبب ذلك على ما قيل ان حمير كانت تتلثم لشدة الحر والبرد فيفعله الخواص منهم فكثر ذلك حتى يفعله عامتهم (1)

یعنی اس کا سبب جیسا کہ کہا گیا ہے یہ ہے کہ قبیلۂ حمیر گرمی اور سردی کی وجہ سے چہروں پر نقاب ڈالے رہتے تھے۔ پہلے خواص یہ کرتے تھے، پھر اس کو اس قدر ترقی ہوئی کہ تمام قبیلے میں اس کا رواج ہو گیا

علامہ موصوف نے ایک اور سبب بھی لکھا ہے۔ وہ یہ کہ قبیلۂ حمیر کی مخالف ایک قوم تھی، جس کا معمول تھا کہ جب حمیر والے کسی ضرورت سے باہر جاتے تھے

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۴۴۴

تو یہ لوگ ان کے گھروں پر حملہ کرتے تھے اور عورتوں کو گرفتار کر لے جاتے تھے، مجبور ہو کر ان لوگوں نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک دفعہ عورتیں مردانہ لباس پہن کر باہر چلی گئیں اور مرد چہروں پر نقاب ڈال کر گھروں میں رہے، دشمنوں نے معمول کے موافق حملہ کیا، یہ لوگ نقاب ڈالے ہوئے نکلے اور نہایت دلیری سے لڑ کر دشمنوں کو قتل کر ڈالا، چونکہ یہ فتح نقاب کے پردہ میں نصیب ہوئی تھی، اس لئے یادگار کے طور پر یہ رسم قائم کر لی گئی، یہاں تک کہ اسلام کے بعد بھی اس قبیلہ کے مرد اور عورت یکساں نقاب پوش رہتے تھے۔ ایک شاعر نے لکھا ہے۔

لما حووا احراز کل فضیلة ۔۔۔ غلب الحیاء علیهم فتلثموا (۱)

بعض اور تمدنی امور سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا، مثلاً جو لوگ حسین اور خوش رو ہوتے تھے۔ اس خیال سے کہ نظر بد سے محفوظ رہیں، چہرہ پر نقاب ڈال کر باہر نکلا کرتے تھے اس کی مثالیں زمانہ اسلام میں بھی ملتی ہیں۔

مقنع کندی جو دولت بنو امیہ کا مشہور شاعر ہے، اسی خیال سے ہمیشہ نقاب ڈال کر باہر نکلتا تھا (۲) رفتہ رفتہ یہ طریقہ زیادہ تر مروج ہو گیا اور بڑے مجمعوں میں اکثر لوگ برقع پہن کر شریک ہوتے تھے، چنانچہ بازار عکاظ میں جو عرب کی حوصلہ افزائیوں کا مشہور دنگل تھا، اہل عرب عموماً چہروں پر نقاب ڈال کر آتے تھے، علامہ احمد بن ابی یعقوب جو نہایت قدیم زمانہ کا مؤرخ ہے، اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ:

وکانت العرب تحضر سوق عکاظ وعلی وجوهها البراقع فیقال ان اول عربی کشف قناعه ظریف بن غنم العنبری ففعلت العرب مثل فعله (۳)

یعنی اہل عرب عکاظ کے بازار میں آتے تھے اور ان کے چہروں پر برقع پڑے ہوتے تھے، کہتے ہیں کہ اول جس عربی نے برقع اتارا وہ ظریف بن غنم تھا، اس کے بعد اوروں نے بھی اس کی تقلید کی۔

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۳۰۴ (۲) کتاب الاغانی ترجمہ مقنع کندی ج ۱۵ ص ۱۵۱ مطبعۃ التقدم مصر (۳) تاریخ یعقوبی مطبوعہ یورپ ج ۱ ص ۳۱۳

تو بعض وقتوں میں خاص اسباب اس طریقہ کے اختیار کرنے کے باعث ہوئے، لیکن اصل میں جس چیز نے اس طریقہ کی بنیاد قائم کی تھی وہ دو امر تھے۔

۱۔ جسمانی حفاظت جس کا ذکر تمہید کے ذکر میں ہو چکا۔ تمہید میں تو عام طور سب اس طریقہ کو برتنے لگے تھے، لیکن اور قبائل میں یہ طریقہ امرا اور اعیان کے ساتھ مخصوص تھا۔ کیونکہ اس قسم کے تکلف اور احترام ظاہری کی خواہش صرف انہی لوگوں کو ہو سکتی تھی۔ رفتہ رفتہ ضرورت کی قید اٹھ گئی اور صرف اس خیال سے کہ نقاب اور برقع امرا کا امتیازی لباس ہے، بے وجہ اور بے ضرورت بھی اس کا استعمال ہونے لگا۔

۲۔ امتیاز اور خصوصیت کا خیال۔ یہ خیال عجیب تدریج کے ساتھ قائم ہوا۔ اہل عرب محض ابتدائی زمانہ میں تو امیر و غریب سب ایک ہی حالت میں رہتے تھے۔ لیکن جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی گئی، اسی نسبت سے امتیازات قائم ہوتے گئے۔ ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ امرا اور سرداران قوم کے دروازے عام نہ ہونے چاہئیں، چنانچہ جاہلیت ہی کے زمانہ میں دربان اور حاجب کے عہدے قائم ہو چکے تھے اور سلاطین اور سرداران قبائل کے دروازوں پر اسی قسم کی روک ٹوک ہوتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ خیال یہاں تک بڑھا کہ بادشاہ دربار میں بھی بیٹھے تو اس کے جمال کی دولت عام نہ ہونے پائے۔ چنانچہ بعض سلاطین عرب صرف اسی خیال سے برقع کا استعمال کرتے تھے۔

عباسیوں کی خلافت میں ایک زمانہ تک یہ طریقہ تھا کہ خلیفہ وقت ایک پردہ کی اوٹ میں بیٹھتا تھا اور تمام شاہی احکام پردہ کی اوٹ سے صادر ہوتے تھے۔ اس میں بھی اسی خیال کا پرتو پایا جاتا ہے۔

جس زمانہ میں اس طریقہ کی ابتدا ہوئی، اس وقت تو عورتیں اس رسم کے ساتھ مخصوص نہ تھیں، لیکن مردوں سے یہ بالتزام ادا نہ ہو سکا۔ چنانچہ جب عکاظ میں طریف بن غنم نے چہرہ سے نقاب ہٹائی تو تمام عرب بھی اس کے مقلد بن کر اس قید سے آزاد ہو گئے۔ کبھی کبھی کسی نے شوقیہ یا فخر کے لحاظ سے استعمال کیا تو وہ رواج عام کے خلاف سمجھا گیا۔ البتہ عورتوں میں یہ رسم اسلام کے زمانہ تک باقی رہی۔ جس کو اسلام

نے اور بھی باقاعدہ اور لازمی کر دیا۔ جس شخص نے عرب جاہلیت کے حالات غور سے پڑھے ہیں وہ تو اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن چونکہ عام خیال یہ ہے کہ پردہ کا رواج اسلام کے زمانہ سے پیدا ہوا، اس لئے ہم متعدد قطعی شہادتیں پیش کرتے ہیں، جن سے ثابت ہوگا کہ اس قسم کا پردہ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا۔

عرب جاہلیت کے حالات معلوم کرنے کے لئے سب سے عمدہ اور مستند ذریعہ شعرائے جاہلیت کے اشعار ہیں، اس لئے اس دعوے کے ثبوت میں ہم جاہلیت کے متعدد اشعار نقل کرتے ہیں۔

ربیع بن زیاد عبسی جو جاہلیت کا ایک مشہور شاعر ہے، مالک بن زہیر کے مرثیہ میں کہتا ہے۔

من كان مسرورا بمقتل مالك فليأت نسوتنا بوجه نهار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوا ہے وہ ہماری عورتوں کو دن میں آ کے دیکھے۔

يجد النساء حواسرا يندبنه يلطمن أوجههن بالأسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتیں برہنہ سر نوحہ کر رہی ہیں اور اپنے چہروں پر صبح کو دو ہتڑ مار رہی ہیں۔

قد كن يخبأن الوجوه تسترا فاليوم حين برزن للنظار (۱)

جو شرم اور ناموس سے ہمیشہ اپنا چہرہ چھپایا کرتی تھیں۔ لیکن آج غم سے مجبور ہو کر دیکھنے والوں کے سامنے بے پردہ آئی ہیں۔

علامہ تبریزی نے تستراً کی شرح میں لکھا ہے عفة وحياء یعنی وہ عفت اور شرم کی وجہ سے چہرہ چھپایا کرتی تھیں۔

عمرو معدیکرب ایک سخت واقعہ جنگ کے ذکر میں کہتا ہے۔

وبدت لميس كأنها بدر السماء إذا تبدى (۲)

اور لمیس کا چہرہ کھل گیا گویا چاند نکل آیا ہے۔

عمرو معدیکرب گو مخضرم شاعر ہے، یعنی اس نے اسلام کا زمانہ بھی پایا تھا لیکن یہ

---

(۱) دیوان حماسہ ج ۱ ص ۵۰ مطبعۃ السعادۃ مصر ۱۳۳۱ھ (۲) ایضاً

اشعار اسلام کے قبل کے ہیں۔

ایک اور جاہلی شاعر جس کا نام سبرۃ بن عمرو فقعسی ہے، اپنے دشمنوں پر طعن کرتا ہے اور کہتا ہے:۔

ونسوتكم في الروع باد وجوهها　　يخلن اماء والاماء حرائر [۱]

یعنی لڑائی میں تمہاری عورتوں کے چہرے کھل گئے تھے　اور اس وجہ سے وہ لونڈیاں معلوم ہوتی تھیں حالانکہ وہ بیبیاں تھیں۔

نابغہ ذبیانی جو زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر ہے، نعمان بن منذر کا بڑا مقرب اور درباری تھا، ایک دفعہ نعمان کی ملاقات کو گیا۔ اتفاق سے وہاں نعمان کی بیوی جس کا نام متجردہ تھا بیٹھی تھی۔ نابغہ دفعتہً جا پڑا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اضطراب میں دوپٹہ گر گیا، متجردہ نے فوراً ہاتھوں سے چہرہ کو چھپا لیا۔ نابغہ کو یہ ادا نہایت پسند آئی، اس پر اس نے ایک قصیدہ لکھا، جس میں اس واقعہ کو اس طرح ذکر کیا ہے۔

سقط النصيف ولم ترد اسقاطه　　فتناولته واتقتنا باليد [۲]

دوپٹہ گر گیا اور اس نے قصداً نہیں گرایا　اس نے دوپٹہ کو سنبھالا اور ہاتھوں سے پردہ کیا۔

ایک اور شاعر عوف نامی یہ ذکر کرکے کہ بھوک کی شدت سے عورتیں نکل آئیں اور یہ بیر جہاں کھانا پک رہا تھا، چولہے کے پاس بیٹھ گئیں، لکھتا ہے:۔

وكانوا قعودا حولها يرقبونها　　وكانت فتاة الحي ممن ينيرها

مبرزة لا يجعل الستر دونها　　اذا اخمد النيران لاح بشيرها [۳]

حقیقت یہ ہے کہ اہل عرب نے زمانہ جاہلیت میں لباس کے متعلق بہت ترقی کی تھی، اگرچہ یہ ترقیاں صرف امراء اور سرداران قبائل تک محدود تھیں۔ لیکن جن لوگوں میں تھیں پوری تہذیب و شائستگی کے ساتھ تھیں۔ عورتوں کے لئے لباس کے جو اقسام اس وقت ایجاد ہو چکے تھے، وہ جسم کے ہر حصہ کے لئے بجائے خود پردہ پوش تھے۔

(۱) یہ اور اس قبیل کے اشعار حماسہ میں موجود ہیں ج ۱ ص ۱۸ (۲) اغانی ترجمہ نابغہ ذبیانی ج ۹ ص ۱۶۱ (۳) مفضلیات، احمد شاکر ص ۱۲۸ دار المعارف قاہرہ

لباس کا یہ تنوع زیادہ تر فرق و امتیاز کی بنا پر تھا اور یہی وجہ تھی کہ عوام کا طبقہ اس سے محروم تھا، جہاں تک ہماری تحقیق ہے، عورتوں کے لباس کے متعلق دولت بنو امیہ اور عباسیہ کے عہد میں کوئی معتد بہ اضافہ نہیں ہوا لیکن زمانہ جاہلیت میں جس قدر لباس ایجاد ہو چکے تھے، اس سے زیادہ اقسام پیدا نہیں ہو سکے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پردہ اور سترپوشی کا خیال جاہلیت ہی میں خوب زور پکڑ چکا تھا، عورتیں مختلف وضع کے کرتے استعمال کرتی تھیں، جن کی قسمیں سات آٹھ سے کم نہ تھیں اور وضع کے اعتبار سے ان کے مختلف نام تھے، مثلاً درع، اتب، قرقل، صدار، مجول، شوذر، قسطلانی، ان میں باہم بہت خفیف فرق ہوتا تھا، ان کی وضع عموماً کرتی، فتوی اور قمیص سے ملتی جلتی تھی، اشعار جاہلیت میں قریباً یہ سب نام ملتے ہیں، لیکن بلحاظ تطویل ہم ان اشعار کو قلم انداز کرتے ہیں، قصابہ، مقنع وغیرہ بھی استعمال کئے جاتے تھے۔

ان کپڑوں کی ترتیب یہ تھی کہ سب سے پہلے ایک رومال سر پر باندھا جاتا تھا، جس سے سر کے دونوں اگلے اور پچھلے حصے چھپ جاتے تھے، لیکن بیچ کا حصہ کھلا رہتا تھا، اس کو تخنیق کہتے تھے، اس کے بعد ایک اور رومال باندھتے، جس سے یہ مقصود ہوتا تھا کہ بالوں میں تیل لگے تو اسی میں جذب ہو کر رہ جائے اور دوپٹہ میلا نہ ہونے پائے، اس کا نام غفارہ تھا، غفارہ کے اوپر مختلف طول و عرض کے دوپٹے استعمال کئے جاتے تھے، جن کے یہ نام ہیں، صدار، خمار، نصیف، مقنعہ، معجر، رداء، خمار سب سے چھوٹا ہوتا تھا، اس سے بڑا نصیف اور نصیف سے بڑا مقنعہ وغیرہ، خمار وغیرہ کو اکثر اس انداز سے اوڑھتی تھیں کہ چہرہ کا اکثر حصہ چھپ جاتا تھا، اسی بنا پر شاعر کا قول ہے۔

سقط النصيف ولم ترد اسقاطه　　　فتناولته واتقتنا باليد

[illegible] الا لاه لم يوسد　　　وقد كان القناع له خمار (۱)

لیکن خاص چہرہ کی حفاظت کے لئے برقع ہوتا تھا، جس کی مختلف قسمیں تھیں، جو صرف آنکھوں تک کا ہوتا تھا اس کو وصواص کہتے تھے، اس سے نیچا نقاب کہلاتا

(۱) اغانی ترجمہ نابغہ ذبیانی ج ۹ ص ۱۰۴

تھا، جو سب سے نیچا نقاب اور اس سے نیچا قناع کے نام سے موسوم تھا۔ خمار جس کی حد ہونٹوں سے متجاوز نہ تھی، سب سے بڑا نقاب جو چہرہ بلکہ سینہ کو بھی چھپاتا تھا، اس کو جلد کہتے تھے۔ نقاب کے یہ تمام اقسام جاہلیت میں جاری ہو چکے تھے اور استعمال کئے جاتے تھے۔ اشعار ذیل سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

اریتن محاسنا وکنن اخری   وثقبن الوصاوص للعیون

یضئی لنا کالبدر تحت غمامۃ   وقد زل عن غر الثنایا لثامہا

غرض لباس کا پردہ تمام عرب میں جاری تھا اور بجز عوام و کنیزوں کے تمام عورتیں اس کی پابند تھیں۔

بعض بعض مثالیں اس رسم کے خلاف ملتی ہیں، مگر وہ نہایت شاذ ہیں۔

لیکن دوسری قسم کا پردہ یعنی عورتوں کا مردوں کی صحبتوں میں شریک نہ ہونا، زمانہ جاہلیت میں بالکل نہ تھا۔ عورتیں عموماً مجلسوں، بازاروں، لڑائیوں میں شریک ہوتی تھیں۔ بازار عکاظ میں جہاں شعراء طبع آزمائیاں کرتے تھے، شاعرہ عورتیں جاتی تھیں اور ان کے مستقل دربار قائم ہوتے تھے، وہ مجمع عام میں قصیدے پڑھتی تھیں اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کرتی تھیں۔

ایک بار خنساء جو مرثیہ کہنے میں تمام عرب میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تھی، عکاظ میں گئی اور نابغہ ذبیانی کے سامنے جو اس وقت استاذ الشعراء تھا، اپنا قصیدہ پڑھا، نابغہ نے کہا افسوس، میں ایک شخص کو اشعر العرب کا خطاب دے چکا ہوں، ورنہ تجھ کو یہ خطاب دیتا، تاہم کہتا ہوں کہ تو عورتوں میں سب سے بڑی شاعرہ ہے۔ خنساء نے کہا نہیں بلکہ میں "اشعر الرجال والنساء ہوں"۔

عام قاعدہ تھا کہ کسی گاؤں میں کسی شاعر کا گذر ہوتا تھا تو وہاں کی تمام عورتیں اس کے پاس آتی تھیں اور شعر پڑھنے کی فرمائش کرتی تھیں اور چونکہ وہ عموماً سخن فہم ہوتی تھیں، شعراء بھی بڑے ذوق سے ان کو اپنے اشعار سناتے تھے۔ غرض معرکہ، مناظرہ، میلے، بازار، دنگل، میدان جنگ، کوئی بزم، مجمع اور مجلس نہ تھی، جس

کی عورتیں ایسے مذاق شریک نہ ہوتی ہوں۔

یہ زمانہ جاہلیت کا حال تھا، اسلام کے زمانہ سے نیا دور شروع ہوا، اس عہد میں جو تغیرات اور اصلاحیں ہوئیں ان کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

اسلام نے سب سے پہلی اصلاح یہ کی کہ جاہلیت میں کرتوں کے گریبان بہت چوڑے ہوتے تھے، جن سے سینے نظر آتے تھے، اس پر قرآن مجید میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ (نور ۲۴: ۳۱)

اور چاہیے کہ وہ اپنے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈال لیا کریں۔

عینی نے بخاری کی شرح میں اس موقع پر لکھا ہے۔

وذلك لأن جيوبهن كانت واسعة تبدو منها نحورهن وصدورهن وما حواليها وكن يسدلن الخمر من ورائهن فتبقى مكشوفة فأمرن بأن يسدلنها من قدامهن حتى يغطينها (۱)

یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ ان کے گریبان چوڑے ہوتے تھے، جن سے ان کے سینے اور اس کے اطراف نظر آتے تھے اور وہ دوپٹے کو پشت کی طرف ڈال لیتی تھیں، اس لئے سینے کھلے رہ جاتے تھے، اس لئے ان کو حکم ہوا کہ سامنے ڈالیں تاکہ سینے چھپ جائیں۔

نقاب اور برقع کا طریقہ گو جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں، پہلے سے جاری تھا، لیکن مدینہ منورہ میں یہود کے اختلاط کی وجہ سے اس کا رواج کم ہو چلا تھا، اکثر عورتیں کھلے منہ نکلتی تھیں، اس پر یہ آیت اتری۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِينَ يُدْنِينَ عَلَيْهِنَّ مِن جَلَابِيبِهِنَّ (احزاب ۳۳: ۵۹)

اے پیغمبر اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمان بیویوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر چادریں ڈال لیا کریں (یعنی چادروں سے منہ چھپا لیا کریں)۔

(۱) عمدۃ القاری ج ۹ صفحہ [illegible] مطبوعہ [illegible]

تخمر وجهها إلا إحدى عينيها (۱)

ایک آنکھ کے باقی سب چہرہ چھپ جائے۔

تفسیر کشاف میں ہے:

فامرن ان يخالفن بزيهن عن زي الاماء بلبس الاردية والملاحف وستر الرؤس والوجوه (۲)

اس لئے ان کو حکم ہوا کہ لونڈیوں کی وضع سے الگ وضع اختیار کریں یعنی چادریں اور برقع استعمال کریں اور سر اور چہرہ چھپائیں۔

ان تصریحات میں ایک خاص امر یاد رکھنا چاہئے، وہ یہ کہ ابن کثیر کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ بی بیوں اور لونڈیوں کے لباس اور وضع میں فرق تھا اور وہ یہ تھا کہ بی بیاں چادروں سے چہرہ چھپاتی تھیں اور لونڈیاں کھلے منہ نکلتی تھیں۔

اشعار جاہلیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے:

ونسوتكم في الروع باد وجوهها يخلن إماء والإماء حرائر (۳)

تمہاری عورتوں کے چہرے لڑائی میں کھل گئے تھے جس سے وہ لونڈیاں معلوم ہوتی تھیں حالانکہ وہ لونڈیاں نہ تھیں۔

ابن کثیر کی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی یہ فرق قائم تھا اور اسی وجہ سے جب کوئی بی بی کھلے منہ نکلتی تھی تو بدمعاشوں کو ان کے چھیڑنے کے لئے یہ عذر ہاتھ آتا تھا کہ ہم نے ان کو لونڈی سمجھا تھا۔

آیت کے معنی کے متعلق دو لفظ بحث طلب ہیں، جلابیب اور ادناء، جلباب کے معنی میں اگرچہ متاخرین نے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، لیکن تحقیق یہ ہے کہ جلباب ایک قسم کا برقع یا چادر تھی، جو تمام کپڑوں سے زیادہ وسیع ہوتی تھی اور اس لئے سب کے اوپر استعمال کی جاتی تھی، جس طرح آج کل ترکی خاتونیں فراج استعمال کرتی ہیں، تفسیر عماد ابن کثیر میں ہے۔

---

(۱) طبقات ابن سعد ذکر ما کان قبل الحجاب ج ۸ ص [illegible] مطبوعہ لیڈن [illegible]

(۲) تفسیر کشاف، تفسیر سورۂ احزاب ج ۲ ص ۲۷۴ (۳) حماسہ ج ۱ ص ۵

والجلباب هو الرداء فوق الخمار قاله ابن مسعود وعبيدة والحسن البصري وسعيد بن جبير وابراهيم النخعي وعطاء الخراساني وغير واحد (۱)

جلباب چادر کو کہتے ہیں جو خمار کے اوپر استعمال کی جاتی ہے۔ عبداللہ بن مسعود، عبیدہ، حسن بصری، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، عطاء خراسانی وغیرہ نے جلباب کے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

دوسرا لفظ جو بحث طلب ہے، وہ ادناء ہے۔ ادناء جلباب کے معنی تمام مستند مفسرین نے جو فن لغت کے بھی امام ہیں، منہ چھپانے کے لکھے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی اور تمام صحابہ میں فن تفسیر کے اعتبار سے ممتاز ہیں۔ ان کا قول تفسیر ابن کثیر میں علی ابن طلحہ کی روایت سے نقل کیا ہے کہ۔

امر الله نساء المومنين اذا خرجن من بيوتهن في حاجة ان يغطين وجوههن من فوق رؤسهن بالجلابيب ويبدين عينا واحدة (۲)

خدا نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ جب گھر سے کسی کام کو نکلیں تو سر کے اوپر سے چادر اوڑھ کر چہروں کو چھپا لیں اور ایک آنکھ کھلی رکھیں۔

تفسیر معالم التنزیل میں اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے۔

قال ابن عباس و ابو عبيدة امر نساء المؤمنين ان يغطين رؤسهن ووجوههن بالجلابيب الا عينا واحدة (۳)

ابن عباسؓ اور عبیدہ کا قول ہے کہ خدا نے مسلمان عورتوں کو حکم دیا کہ چادر سے اپنا سر اور چہرہ چھپالیں بجز ایک آنکھ کے۔

طبقات ابن سعد میں ہے۔

محمد بن عمر عن ابي سبرة عن ابي صخر عن ابن كعب القرظي قال

محمد بن عمر نے ابو سبرہ سے، انھوں نے ابو صخر سے، انھوں نے ابن کعب قرظی سے روایت

(۱) حاشیہ فتح البیان ج ۸ ص ۳۳۲ (۲) ایضاً (۳) معالم التنزیل تفسیر سورہ احزاب ص ۲۲۲ مطبع بمبئی

کان رجل من المنافقین یتعرض لنساء المومنین یوذیھن فاذا قیل له قال کنت احسبھا امة فامرن اللہ ان یخالفن زی الاماء ویدنین علیھن من جلابیبھن تخمر وجھھا الا احدی عینیھا (۱)	کی ہے کہ مدینہ میں ایک منافق تھا جو مسلمان خاتونوں کو چھیڑا کرتا تھا اور جب اس کو ٹوکا جاتا تھا تو کہتا تھا کہ میں نے لونڈی سمجھا تھا تو خدا نے حکم دیا کہ لونڈیوں کی وضع ترک کریں اور اپنے اوپر اس طرح سے چادر ڈال لیں کہ چہرہ چھپ جائے، بجز ایک آنکھ کے۔

تفسیر کشاف میں ادناء جلباب کی یہ تفسیر کی ہے۔

یرخینھا علیھن و یغطین بھا وجوھھن (۲)	چادر کو اپنے اوپر ڈال لیں اور چہرہ کو چھپا لیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ابوعبیدہ، ابن کعب قرظی، بغوی ابن کثیر اور زمخشری اس درجہ کے لوگ ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اگر کسی مخالف کا قول ہوتا بھی تو اس کی کیا وقعت ہو سکتی، لیکن جہاں تک ہم کو معلوم ہے شاہ ولی اللہ کے سوا تمام اہل لغت اور مفسرین نے یہی معنی بیان کئے ہیں۔

اس صورت میں صرف شاہ ولی اللہ صاحب کے مبہم ترجمہ سے ایسے معرکۃ الآراء مسئلہ میں استدلال کرنا کس قدر تعجب انگیز ہے۔

پردہ کے متعلق تمام دنیا میں مسلمانوں کا جو طریق عمل رہا، وہ یہ تھا کہ کبھی کسی زمانہ میں عورتیں بغیر برقع اور نقاب کے باہر نہیں نکلتی تھیں اور بجز کسی خاص حالت کے نامحرموں سے ہمیشہ منہ چھپاتی تھیں، یہاں تک کہ یہ امر معاشرت کا سب سے بڑا مقدم مسئلہ بن گیا تھا۔

تصدیق اس کی واقعات ذیل سے ہوگی۔

ایک دفعہ مغیرہ بن شعبہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ میں فلاں عورت سے شادی کرنی چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ پہلے جا کر

---

(۱) طبقات ابن سعد ذکر ما کان قبل الحجاب ج ۸ ص ۱۲۶ (۲) تفسیر کشاف ج ۲ ص ۱۳۳

اس کو دیکھ لینا۔ انھوں نے یہ کر کے اس عورت کے والدین سے اپنا ارادہ ظاہر کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام سنایا۔ صحابہ جس قدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی اطاعت کرتے تھے، محتاج بیان نہیں۔ تاہم والدین کو ناگوار ہوا کہ لڑکی ان کے سامنے آجائے اور یہ اس پر نظر ڈال سکیں۔ لڑکی پردہ میں سے یہ باتیں سن رہی تھی، بولی کہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے تو تم کو اگر دیکھ لو ورنہ میں تم کو خدا کی قسم دلاتی ہوں کہ ایسا نہ کرنا۔ یہ واقعہ سنن ابن ماجہ باب النکاح میں مذکور ہے۔ (۱)

محمد بن مسلمہ ایک صحابی تھے انھوں نے ایک عورت سے شادی کرنی چاہی اور اس لئے چاہا کہ چوری چھپے کسی طرح عورت کو دیکھ لیں۔ لیکن موقع نہیں ملتا تھا، یہاں تک کہ ایک دن وہ عورت اپنے باغ میں گئی، انھوں نے موقع پا کر اس کو دیکھ لیا۔ لوگوں کو معلوم ہوا تو نہایت تعجب سے لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ صحابی ہو کر ایسا کام کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب کسی عورت سے شادی کا ارادہ ہو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں کہ پہلے اس کو دیکھ لیا جائے۔ (۲)

صاحب اغانی نے اخطل کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ اخطل سعید بن ایاس کا مہمان ہوا۔ سعید نے بڑے تپاک سے مہمان داری کی، یہاں تک کہ اس کی دونوں لڑکیاں جن کا نام زعوم و [illegible] تھا، اخطل کی خدمت گذاری میں مصروف رہیں۔ دوسری دفعہ جب اخطل کو یہ موقع پیش آیا تو یہ لڑکیاں جوان ہو چکی تھیں، اس لئے اخطل کے سامنے نہ آئیں۔ اغانی کے خاص الفاظ یہ ہیں:

ثم نزل عليه ثانية وقد كبرتا فحجبتا عنه فسال عنهما وقال فاين ابنتاي فاخبر بكبرهما (۱)	اخطل دوبارہ سعید کا مہمان ہوا تو لڑکیاں بڑی ہو چکی تھیں، اس لئے انھوں نے پردہ کیا، اخطل نے پوچھا کہ میری لڑکیاں کہاں ہیں، سعید نے کہا، اب وہ بالغ ہو گئی ہیں۔

(۱) سنن ابن ماجہ باب النظر الی المرأۃ اذا اراد ان یتزوجہا ص [illegible] مطبع [illegible]
(۲) ایضاً (۱) اغانی ج ۷ ص ۱۷۱

مجمع پر ایک کیفیت طاری تھی اور جو زیادہ تر میری ہی مدح میں تھے۔ ان سب کے بیچ میں میں اس سلطان ذی اقتدار کے ساتھ تھا، جس کے رکاب بوسوں میں سے ہر ایک یہ چاہتا ہو کہ ان آداب خدمت کے بجا لانے میں دوسرے سے آگے نکل جائے۔ جس نے مشرقی قوموں کو ان معاملات میں اخلاقی تنزل سے تمام ہو کہ ہے۔ میں ان اشعار کو کان لگا کر گھنٹوں تک سنتا رہا اور بعض اشعار میں نے یاد بھی کر لئے۔ یہ تمام اشعار مسلسل رجز تھے۔ جن کے معنی منفرداً مجھ میں نہیں آتے تھے۔ کچھ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کون مادح ہے۔ کون ممدوح، کون مخاطب ہے کون متکلم۔ غرض ہم یورپین لوگوں کو ان کا سمجھنا بالکل دشوار تھا۔

اس وقت میری عمر ۲۵ برس کی تھی۔ جاڑوں کا زمانہ اور نہایت خوشگوار دن تھا، جس کی گرمی سے بدن میں نشاط پیدا ہوتا تھا اور روشنی نہایت تیز تھی۔ خوشبو راہ گیروں کو بدمست کئے دیتی تھی اور سونگھنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ لذائذ زندگی کے انتہائی درجہ سے متمتع ہو رہا ہے۔ اس حالت میں مجھ پر ایک اور احساس طاری تھا، یعنی اس معشوق کا تصور جس کا نام ان سواروں کی زبانوں پر صبح و شام جاری رہتا تھا۔

ہم اسی حالت میں چلے جا رہے تھے کہ ہمارا شاعر دفعتہً چپ ہو گیا اور ذرا سخت آواز سے (میری طرف مخاطب ہو کر) بولا کہ جناب! اب نماز عصر کا وقت آ گیا۔ اس آواز کے ساتھ تمام سوار گھوڑوں سے اتر پڑے اور صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ مسلمانوں میں جماعت کی نماز کو تنہا نماز پر شرف حاصل ہے۔ جیسا کہ ہم عیسائیوں میں بھی ہے۔ میں جماعت سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور دل میں کہتا تھا کہ زمین پھٹ جاتی تو میں سما جاتا۔ ان جوانوں کے شملے، نماز کی مختلف حرکتوں سے کبھی پیچ کھاتے اور کبھی کھل جاتے تھے۔ وہ نہایت بلند آواز سے بار بار اللہ اکبر کہتے تھے اور یہ پر جلال آواز میرے دل میں وہ اثر کرتی تھی کہ مومنین اور متکلمین کی تحریروں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ میرے دل پر شرم اور انفعال کا وہ اثر تھا، جس کے ادا کرنے کے لئے مجھ کو کوئی لفظ نہیں ملتا۔ یہ گروہ جو ابھی میرے سامنے گردن جھکا رہا تھا، صاف محسوس کرنے لگا کہ نماز نے ان کو دفعتہً مجھ سے بہت زیادہ معزز اور بلند مرتب کر دیا ہے اور اگر اس وقت

میں اپنے دل کے کہنے پر چلتا تو بے ساختہ چلا اٹھتا کہ "میں بھی خدا کا معترف ہوں، مجھ کو بھی نماز کا ادا کرنا آتا ہے"۔

حقیقت میں وہ عجیب و دلفریب سماں تھا، وہ اپنے معمولی لباس کے ساتھ کس بے تکلفی سے نماز ادا کر رہے تھے اور ان کے پہلو میں گھوڑے اس طرح چپ چاپ کھڑے تھے کہ گویا نماز کے ادب نے ان کو سرنگوں کر دیا ہے۔ گھوڑوں کا یہ درجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمال محبت کی وجہ سے جبریل کی ہدایت کے موافق ان کے منہ کو اپنی ردا سے پونچھتے تھے۔

ان وسیع میدان میں صرف ایک میں تھا جو تنگ فوجی لباس میں تھا، جو انسان کو شکنجہ میں کس دیتا ہے اور جس سے کسی قسم کی شان کا اظہار نہیں ہوتا۔ میری حالت سے بے دینی ٹپک رہی تھی۔ حالانکہ میں اس وقت ایسے مقام میں تھا، جو مذہب کا مولد و منشا ہے۔ اس عبادت گزار گروہ کے آگے جو اپنے خدا کے آگے بار بار نہایت خشوع سے نماز کے فرائض اس دل سے بجا لا رہا تھا جو سچائی اور ایمان سے لبریز تھا۔ میں بالکل ایک جماد یا کتا معلوم ہوتا تھا۔ اس حالت میں مجھ کو توراۃ کی وہ آیت یاد آئی کہ خدا سام کے خیمہ میں سکونت کرے گا اور یافث کی اولاد کو ترقی دے گا۔ یہ دونوں گروہ اس وقت یکجا تھے۔ یعنی وہ نماز گزار جو سام کی اولاد سے تھے اور جو اپنے مذہب اور اس خدا پر شیدا تھے۔ جو ابراہیم کے خیمہ میں داخل ہوا تھا اور میں یافث کی اولاد ہوں اور جس کا شہرہ صرف فتوحات اور لڑائیوں پر موقوف ہے۔

غرض جب منزل ختم ہو گئی اور میں فرودگاہ پر واپس آیا تو جو خیالات میرے دل میں آئے تھے ان کو قلمبند کرنے لگا۔ اس وقت میں محسوس کر رہا تھا کہ مجھ کو اسلام کی حلاوت اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ گویا میں نے اس سے پہلے کبھی کسی صحرا میں کسی قوم کو عبادت بجا لاتے دیکھا ہی نہیں تھا۔ مجھ کو اس وقت عیسائیوں کے گرجے یاد آگئے جہاں صرف عورتوں کی پرستش کی جاتی ہے اور اس خیال سے مجھ کو یورپ کی بد دینی پر غصہ آگیا۔

یہ میری عمر کا وہ زمانہ تھا، جب عقل، مشکلات کو حل کرنا نہایت آسان سمجھتی ہے، اور جب انسان تمام چیزوں کو سطحی نگاہ سے دیکھتا ہے، جب کہ محض خیال، تلون مزاجی اور تنقید کا منصب حاصل کرتا ہے اور جب کہ انسان کے اعتقادات بے قید ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ عمر ہے کہ اگر اس عمر کے آدمی انصاف سے کام لیتے تو تضحیک و تحقیر کو ہاتھ تک نہ لگاتے۔ میرا خیال تھا کہ مذہب کی شان، مذہب کی سچائی کی خود ایک بہت بڑی دلیل ہے، میں اسلام کے متعلق کچھ لکھنے لگا اور مجھ کو کچھ خبر نہ تھی کہ قلم اس وقت بالکل دل کے قابو میں ہے۔

کتاب کے شروع کرنے سے پہلے مجھ کو یہ بتانا ضرور ہے کہ مجھ کو اسلام کے متعلق کچھ لکھنے کا کیا خاص حق حاصل ہے۔ میں نے مدت تک اہل عرب کے ساتھ زندگی بسر کی ہے اور مشرقیوں کے مزاج اور طبیعت کے دریافت کرنے میں اکثر مصروف رہا ہوں۔ میرا طریقہ وہی ہے جو الجزائر کے مستشرقوں کا ہے اور اسی بنا پر میں سب سے پہلے معزز مستشرقوں سے با ادب و نیاز یہ درخواست کرتا ہوں کہ مجھ کو ان لوگوں کی فہرست میں نہ داخل کریں جن کا یہ حال ہے کہ وہ عرب کا رخ کرتے ہیں اور چند روز کی سیاحت میں ادھر ادھر کی گپیں سن کر اسلام کے متعلق لکھنے بیٹھ جاتے ہیں، اس لئے ان کی تحریر محض شاعرانہ ہوتی ہے، یہاں تک کہ ہیوگو اور لوران بھی اس قسم کی لغزش سے نہ بچ سکا۔ اس کا قلم بیک سر ہو کر تخیل کی کشش میں آ گیا، اس کو مشرق کی ہر چیز عجیب معلوم ہوتی تھی۔ ان لوگوں میں اسلام کے متعلق ایک فسانہ گوئی داخل ہے نہ کہ تحقیر ہے۔ معتقد تو ہیں، میں ان کی طرح خواہ مخواہ اسلام کی شان بڑھانا نہیں چاہتا، لیکن چونکہ میں دیکھتا ہوں کہ موجودہ زمانہ میں یہ ایک بڑا مستقل پولیٹکل مسئلہ بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ خاص ان مباحث کے لئے پیرس میں ایک علمی میگزین جاری ہوا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ صلیب پرست عیسائی مسجد بنانے کی غرض سے مسلمانوں کو مالی امداد دیتے ہیں، اس بنا پر میں نے اس موقع کو اس بات کے لئے غنیمت جانا کہ ہم لوگوں کے دماغ میں پیغمبر عرب اور مذہب اسلام کے متعلق جو غلط خیالات جم گئے

ہیں، ان سے لوگوں کو متنبہ کروں۔

یہ ایک نہایت مشکل کام ہے کیوں کہ یہ مسلم ہے کہ لا یرسخ فی الاعتقاد اکثر من خطاء الاعتقاد۔ میرا یہ خیال ہے کہ عیسائیوں کی شائستہ قوموں کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کے مذہب کی عزت کریں بلکہ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ اس مذہب کی حقیقت سے بخوبی واقف ہوں، ہم کو ان قصوں کے سننے سے ہنسی آتی ہے، جن میں یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمان عیسائیوں سے کس قدر عناد رکھتے ہیں، اس وقت ہم کہتے ہیں کہ مسلمان متعصب اور جاہل قوم ہیں اور اس عناد پروری میں ان کو معذور سمجھنا چاہئے، لیکن اسی طرح عیسائی بھی مسلمانوں سے نفرت رکھتے ہیں اور انصاف سے کام نہیں لیتے۔

مذہب اسلام کے متعلق سب سے زیادہ غلط اوہام جو ہم لوگوں میں پھیل گئے ہیں، وہ خاص پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کی نسبت ہیں، اس لئے میں نے ارادہ کیا کہ سب سے پہلے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اور ان کی اخلاقی حالت کے متعلق بحث کروں، مجھ کو امید ہے کہ یہی بحث ان کی سچائی اور دیانت داری کی ایک عمدہ دلیل ثابت ہوگی، جس پر قریباً تمام مذاہب کے مورخین اور بڑے بڑے عیسائی متفق اللفظ ہیں۔

* * * * * *

پہلی فصل

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی

تلمسان کے ایک طالب العلم سے میں مذہبی مباحثات کیا کرتا تھا وہ جب مناظرہ سے گریز کرنا چاہتا تھا تو کہتا تھا کہ عیسائی تو کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ خدا کی اولاد ہے اور محمد جادوگر تھے۔ اس کے یہ الفاظ حقارت سے لبریز ہوتے تھے۔ جس طرح کسی بت پرست سے اس کی حالت پر ترس کھا کر خطاب کیا جائے۔ حالانکہ یہ طالب العلم میرا بہت ادب کرتا تھا اور مجھ سے بہت دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جس طرح محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کا ساحر ہونا ، افترائے محض ہے۔ اسی طرح تثلیث کا اعتقاد بھی محض تہمت ہے اور یہ کہ ایسی قوم سے جو اس قسم کی لغو باتوں کے قائل ہوں گفتگو کرنا بھی عبث ہے۔

لیکن اگر مسلمانوں کو وہ قصے معلوم ہوں جو عیسائیوں میں قرون وسطیٰ کے زمانہ میں مشہور تھے اور ان گیتوں سے اطلاع ہو جو عیسائیوں میں گائے جاتے تھے تو معلوم نہیں مسلمانوں کو کس قدر حیرت ہوگی۔ بارھویں صدی عیسوی کے قبل تک جس قدر گیت ہم لوگوں میں پھیلے ہوئے تھے گویا سب ایک دماغ کے نتیجے تھے۔ یہی گیت ہیں جن کی بدولت کروسیڈ کی لڑائیاں برپا ہوئیں۔ ان سب کا موضوع مسلمانوں سے سخت تنفر پیدا کرنا تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے مذہب سے لوگ بالکل جاہل تھے۔ انہیں گیتوں نے ان بیہودہ روایتوں کو دلوں میں راسخ کر دیا اور انہیں کی بدولت یہ غلط فہمیاں قائم ہو گئیں۔ جن میں سے اکثر آج بھی قائم ہیں۔

ان گیتوں کے گانے والے عموماً یقین رکھتے تھے کہ مسلمان مشرک اور بت پرست ہیں اور وہ تین خدا کے قائل ہیں۔ جن کے درجے مختلف ہیں۔ ایک کا نام

ماہومت ماہون یا بافومیہ یا ماہومیہ ہے، دوسرا اپلین، تیسرا ترقاجان، ان لوگوں کا خیال تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دین میں اپنے آپ کو بھی خدا قرار دیا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (جو درحقیقت بت کے دشمن اور بتوں کے برباد کرنے والے تھے) نے اپنی صورت کا ایک زریں بت بنایا تھا اور لوگوں سے اس کی پوجا کراتے تھے، جیسا کہ لوز قبیون کا اعتقاد تھا، یہ لوگ بیان کرتے ہیں کہ جب عیسائیوں نے مسلمانوں پر فتح پائی اور ان کو سرقسطہ کی دیوار تک ہٹا لے گئے تو مسلمانوں نے جا کر اپنے تمام بت جن کو وہ پوجتے تھے، توڑ ڈالے، چنانچہ عہد وسطیٰ کے ایک مصنف کا بیان ہے کہ مسلمانوں کا خدا اپلین ایک غار میں تھا۔ مسلمانوں نے اس پر پتھر برسائے اور خوب دل کھول کر اس کو گالیاں دیں، پھر سولی پر چڑھایا اور خوب پامال کیا، اور مارے ڈنڈوں کے اس کے ریزے ریزے کر دئیے۔

ماہومد کو جو دوسرا خدا تھا، ایک گڑھے میں پھینک دیا، یہاں تک کہ سور اور کتے اس کو نوچتے اور روندتے تھے، اس طرح کی اہانت کبھی کسی خدا کی نہیں ہوئی تھی، لیکن مسلمانوں نے پھر توبہ کی اور اپنے خداؤں سے معافی چاہی اور ان کی مرمت و اصلاح کی، اسی بنا پر امیر کارلوس جب سرقسطہ میں داخل ہوا تو اس نے حکم دیا کہ یہ سارے بت برباد کر دئیے جائیں، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے کہ امیر نے فریق کو حکم دیا کہ وہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں پھرے اور مسجدوں اور جامع مسجدوں میں گھس کر آہنی گرزوں سے ماہومد اور تمام بتوں کو توڑ دے، ریشار نے بھی اپنے قصیدہ میں یہ روایت بیان کی ہے کہ یہ اشعار فی نفسہ بہت اچھے ہیں، لیکن سرتا پا تہمت اور افتراء ہیں، ان میں خدا سے یہ دعا کی گئی ہے کہ ماہومد کی پرستش کرنے والے برباد ہو جائیں، پھر شاعر نے ملک کو جنگ مقدس کی ترغیب دی ہے اور ان کو ان الفاظ میں نصیحت کی ہے ۔۔ اٹھو اور ماہومیہ اور ترفاجان کو برباد کر دو، ان کو آگ میں ڈال دو اور خدا کے آگے ان کو قربانی پیش کرو، ان شعراء کا خیال تھا کہ ماہومد کا بت نہایت اعلیٰ درجہ کی کاریگری کے ساتھ قیمتی پتھروں اور جواہرات سے بنا ہوا تھا، چنانچہ اگر کوئی شخص

رولان کے اشعار پڑھے تو عجب نہیں کہ قسم کھانے پر تیار ہو جائے کہ شاعر چشم دید واقعات بیان کر رہا ہے۔ ان اشعار میں بیان کیا ہے کہ یہ بت خالص سونے چاندی کے تھے اور اگر تم ان کو دیکھتے تو تم کو یقین آ جاتا کہ ان سے بڑھ کر خوبصورت، خوشنما، لطیف الصنعت، پر رعب ہونا عقل میں نہیں آ سکتا۔ ماہوم بالکل خالص چاندی اور سونے کا بنا ہوا تھا اور اس کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ وہ ایک ہاتھی پر دھرا ہوا تھا، جس کا ہودج اعلیٰ سے اعلیٰ کاریگری کا بنا ہوا تھا، وہ اندر سے خالی تھا اور اس وجہ سے اس کی چمک پھوٹ کر نکلتی تھی۔ اس میں نہایت قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے اور اس کا اندر کا حصہ چمک کی وجہ سے باہر سے نظر آتا تھا۔ یہ ایک اعلیٰ کاریگری تھی جو بالکل بے نظیر تھی۔ چونکہ دیوتاؤں کا قاعدہ ہے کہ مشکل کے وقت وہی بھیجتے ہیں۔ اس لئے جب مسلمانوں نے ایک معرکہ میں شکست کھائی تو ان کے سردار نے لشکر میں مدد مانگنے کے لئے قاصد بھیجا۔ اس وقت ان کا دیوتا ماہومد بڑی شان و شوکت سے ڈھول و نقارہ کے ساتھ آیا، جس کی گونج دور دور تک جاتی تھی۔ بعض بانسری بجاتے آتے تھے اور بعضوں کے ہاتھ میں چاندی کی جھانجھ تھی اور یہ سب کے سب ماہومد کے گرداگرد ناچتے اور بڑے زور سے گاتے آتے تھے۔ اس ساز و سامان کے ساتھ فرودگاہ میں پہنچے، جہاں خلیفہ اسلام ان کا انتظار کر رہا تھا۔ جب خلیفہ نے ماہومد کو دیکھا تو نہایت خضوع اور ادب کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور بندگی بجا لایا۔

اس کے بعد ریچارڈ نے بیان کیا ہے کہ یہ بت پرست کیوں کر اس مجوف بت سے جس کے اندر کی چیزیں باہر سے نظر آتی تھیں، دعائیں مانگتے تھے۔ ریچارڈ کا بیان ہے کہ اس بت کے اندر جادوگروں نے ایک عفریت کو بند کیا تھا، وہ چیخ کر بولتا تھا اور پھر اس نے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر باتیں کیں۔

عیسائی شعراء اس (فرضی) بت سے نہایت عداوت رکھتے تھے۔ چنانچہ جس طرح صلیب عیسائیوں کی مذہبی علامت ہے، ان لوگوں نے اس بت کو مسلمانوں کی علامت قرار دیا۔ چنانچہ بودوان نے وینس کے متعلق جو نظم لکھی ہے اس میں لکھا ہے کہ جب

کہ در حقیقت ہیچ سمجھتے تھے تو میں نامنصف واعظ کی طرح جواب میں ہاں بھی کہوں گا اور نہیں بھی، کیونکہ یہ غلطی ہے کہ چونکہ مسلمان اور عیسائی باہم ملتے جلتے رہتے تھے، اس لئے مذہب اسلام کی حقیقت سے واقف ہونا مشکل نہ تھا۔ لیکن وہ در حقیقت یہ چاہتے ہی نہ تھے کہ اپنے اشعار میں کوئی سچے واقعات بیان کریں، ان کا مقصد صرف عیسائیوں میں بغض اور نفرت کی روح کا پھونکنا تھا، اس لئے ان کو ضرورت تھی کہ مسلمانوں اور ان کے پیغمبر اور ان کے مذہب کے ایسے اوصاف بیان کریں، جو ان لوگوں کے مذاق اور معلومات کے موافق ہوں، جن کے سامنے یہ اشعار پڑھے جاتے تھے۔

ان شعراء سے قطع نظر کر کے جب ہم زمانہ مابعد کی ان متکلمین کی تصنیفات پڑھتے ہیں، جن کی رائیں اعتدال کی طرف مائل ہوتی ہیں تو یہ تصنیفات بھی خرافات اور سب و شتم سے مملو نظر آتی ہیں۔ طرہ یہ کہ گروہ مصلح یعنی پروٹسٹنٹ کا تعصب اور زیادہ بڑھا ہوا ہے، چنانچہ جلنڈر نے محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نعوذ باللہ) .... سے تشبیہ دی ہے اور قرآن و شریعت اسلام کو بھی انہیں لفظوں سے یاد کیا ہے، ہم کو اس دعوے پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ ناظرین کو اپنی توجہ ریلان کی کتاب کے دیباچہ کی طرف مبذول کرنی چاہئے، یہ کتاب ۱۷۲۱ء میں چھپی ہے اور اس کا موضوع یہ ہے "مذہب اسلام کے متعلق لوگوں کو کیسی بہت کم واقفیت ہے"۔

مصنف مذکور کہتا ہے کہ ارباب بحث کو اگر یہ مقصود ہو کہ کسی مذہب یا طریقہ پر ذلت و عار کا داغ لگائیں تو ان کو صرف یہ کہنا چاہئے کہ وہ مذہب محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف منسوب ہے۔ جب وون مارشتو انتانسو قیتا لدو نے ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام "کلیسائے مقدس و دینی کا چراغ" ہے، اس کتاب میں وہ لکھتا ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کتاب کو پڑھنا نہیں چاہئے، بلکہ انسان کا یہ فرض ہے کہ اس کے ساتھ احتراز کرے اور آگ میں جلا دے، اس کو محفوظ رکھنا جانوروں کا کام ہے"، بعضوں کی یہ رائے ہے کہ جلانا نہیں چاہئے، لیکن ایسے نسخ

مزخرفات کے یاد کرنے میں انسان کو اپنا وقت صرف نہ کرنا چاہئے جو ایک ...... آدمی کے خیالات ہیں۔

یہ رائیں تو قرآن مجید اور بانی اسلام کے متعلق ہیں۔ باقی مسلمان تو ان کو ان تصنیفات میں ان الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ پلید۔ سست۔ گنوار۔ خر صحرائی۔ قابل نفرت وہ لوگ جن کا یہ کام ہے کہ رات کو اپنا گھر عورتوں سے بھر لیتے ہیں اور صبح کو ان کو طلاق دے دیتے ہیں" اور اگر تم کو گالیوں کا خزانہ دیکھنا ہو تو ایک عیسائی کی کتاب دیکھو جس کا نام بروشار ہے۔ اس کتاب کا نام رہنمائے سفر ہے۔ مصنف نے یہ کتاب امیر فلپ دوالو کی خدمت میں ۱۲۲۳ء میں پیش کی تھی۔ اس میں اس نے بیان کیا ہے کہ کروسیڈ کی لڑائیاں کن اسباب سے ظہور میں آئیں۔ چنانچہ کہتا ہے کہ کون ہے جو یہ دیکھ کر آنسو نہ بہائے گا کہ جو زمین ہماری میراث تھی، ان پر اس قوم نے قبضہ کر لیا ہے۔ جن کے نہ خدا ہے، نہ مذہب، نہ شریعت، نہ اقرار، نہ دھرم، یہ لوگ دنی اور کمینہ ہیں اور سچائی اور صداقت۔ نیکی اور عدل کے دشمن ہیں۔ خدا کے منکر ہیں۔ عیسائیوں پر جبر کرتے ہیں۔ نہایت کثرت سے شادیاں کرتے ہیں، لڑکوں سے بدکاری کرتے ہیں، بے زبان جانوروں پر ظلم کرتے ہیں، فطرت انسانی کے مخالف ہیں، فضائل کے قاتل ہیں۔ اخلاق کے مار ڈالنے والے ہیں، گناہوں اور برائیوں میں مستغرق ہیں، شیطان کے دوست ہیں، کمینہ باتوں کے حامی ہیں، کینہ ور ہیں۔ پست خیال ہیں۔ ان کے افعال مبتذل، زندگی پست، باتیں فحش،.. معاشرت حقیر اور جانوروں سے۔ ان کے ارادے اور حوصلے جب مائل ہوتے ہیں تو صرف حیوانی خواہشوں کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہم لوگوں کو ان مقامات سے نکال دیا اور چھوٹی سی جگہ میں بھی جہاں ہم رہتے ہیں، ہم کو ستاتے ہیں، ہمارے ساتھ اور ہمارے مذہب کے ساتھ تمسخر اپن کرتے ہیں، انھیں لوگوں نے خدا کے گھر کو برباد کر دیا اور اس پاک شہر پر قابض ہو گئے، جو ہماری شریعت کا فرودگاہ ہے اور ان پاک مقامات کو نجس کر دیا*۔

اس قسم کے خیالات عیسائیوں میں ایک مدت تک پھیلے رہے۔ یہاں تک کہ ہمفری پریڈو نے ۱۶۹۷ء میں ایک کتاب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات میں تصنیف کی اور اس کے دیباچہ میں اس تصنیف کا مقصد یہ بیان کیا "اس کتاب کی تصنیف کا مقصد اس شخص کی سوانح عمری کے لکھنے کے ذریعہ سے عیسائی تکلیفانہ مقصد کی خدمت گزاری ہے۔" ان مصنفوں نے درحقیقت اپنا مقصد تاریخ نویسی نہیں قرار دیا بلکہ ان کا مقصد جیسا کہ خود ان کا بیان ہے۔ عیسائی مذہب کی خدمت گزاری ہے۔ یہ لوگ اپنے جدل و مناظرہ کی تائید میں جو ہتھیار استعمال کرتے تھے وہ محض دشنام دہی اور سخت کلامی تھی۔ اس کے ساتھ روایت اور نقل میں جس قدر تحریف ممکن تھی کر سکتے تھے۔ صرف والاسین نے یہ قصد کیا کہ ان تمام تصنیفات کی مخالفت کرے، جس کی وجہ یہ تھی کہ وہ شام میں پلا تھا اور خلفائے اسلام کا مقرب تھا، چنانچہ اس نے مذہب اسلام کے رد میں جو کچھ لکھا بلاتعصب لکھا۔ اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اسلام عیسائی مذہب کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جیسا کہ ایرونگ کا خیال تھا۔ تاہم یورپ پر اس کی تصنیف کا کچھ اثر نہ ہوا اور ان کے جو بیہودہ خیالات پیغمبر اسلام اور قرآن کی نسبت تھے، اسی طرح قائم رہے۔ پیشوایان مذہب (انگلی پادری اور بشپ وغیرہ) بھی انہی خیالات کو قوت دیتے تھے اور لوگوں کے ذہن میں بٹھاتے تھے۔ اسی پالیسی کا نتیجہ ہے کہ لوگ اسلام کے ساتھ استہزا کرتے ہیں۔ ان خیالات کی اشاعت نے یورپ کو مذہبی لڑائیوں سے بے نیاز کر دیا۔ چنانچہ لاطینی چرچ جو تیرھویں صدی میں اور کاموں میں مشغول تھا، کیونکہ مشرقی چرچ دو متمدن مصیبتوں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک یہ کہ ایک ہی روح کے دو جسم بن گئے، دوسرے یہ کہ ایک روح تھی اور ایک ہی جسم بھی تھا۔

اسلام کے متعلق آزادانہ اور غیر متعصبانہ بحث ہمارے زمانہ سے آغاز ہوئی، کیونکہ انیسویں صدی میں لوگوں نے اس مسئلہ کو ایک محقق کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کے متعلق مختلف رائیں قائم ہو گئیں، کچھ لوگ

قرآن کے گرویدہ ہو گئے اور بعضوں نے نکتہ چینی کی۔ ۲۱ ہم اس قسم کے لوگوں میں اب
بھی قدرے خیالات کی بو آتی ہے۔ مانسیو ڈوٹی نے عرب کا سفرنامہ [illegible] میں شائع
کیا۔ اس میں پیغمبر اسلام کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ...... تھے۔ لیکن ان کو یہ خیال نہیں
رہا کہ اب یہ الفاظ کسی دعویٰ کی صحت کے دلیل نہیں ہو سکتے۔

پہلی بحث جو پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اپنی
رسالت میں سچے تھے یا نہیں۔ حالانکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ امر مستشرقین اور محققین سب
کے نزدیک مسلم ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کو قرآن کے منزل من اللہ ہونے سے
کوئی تعلق نہیں ہے۔ کیونکہ پیغمبر کی سچائی ثابت کرنے کے لئے صرف اس قدر ثابت
کرنا کافی ہے کہ ان کو اپنی نبوت پر پورا یقین تھا اور وہ اپنے آپ کو سچا پیغمبر سمجھتے تھے۔
باقی آپ کی پیغمبری کا مقصد تو خدائے واحد کی پرستش کا قائم کرنا تھا۔ بجائے اس بت
پرستی کے جو آپ کے قبیلہ میں ابتداء سے قائم تھی۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت
اسماعیلؑ پر جب سارہ خفا ہوئیں اور اپنے گھر سے نکال دیا تو وہ عرب کو چلے آئے اور
اپنے باپ ابراہیم کے مذہب کو عرب میں شائع کیا۔ لیکن عرب میں اس مذہب کا اثر
بالکل ایک خیال سا رہ گیا تھا .... کیونکہ عرب میں
ایسے لوگ نہ تھے جو یاد دلاتے رہتے کہ ابراہیم کا خدا غیور ہے اور شرکت گوارا
نہیں کرتا۔ بخلاف اس کے بنو اسرائیل میں ایسے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے۔ بہرحال
وہ اسمٰعیلی مذہب روز بروز زائل ہوتا گیا اور بجائے اس کے ان خداؤں کی پرستش قائم
ہوگئی۔ جن کی پرستش اور قوموں میں ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ اسماعیلی مذہب بالکل
فنا ہوگیا۔ اس کے بعض قبائل عرب میں جو شام کے ہمسایہ تھے۔ یہودیت کا عام رواج
ہوا۔ لیکن عیسوی مذہب نے ان مقامات میں ظہور نہیں کیا۔ چنانچہ جیمس نے جو چوتھی
صدی عیسوی میں بصرہ کا بشپ تھا۔ خود اقرار کیا ہے کہ عرب کی خانہ بدوش زندگی
عیسوی مذہب کو پھیلنے نہیں دیتی۔

عرب میں ساتویں صدی تک مذہب کی یہ حالت رہی۔ اس زمانہ کی نسبت

مصنفوں نے اپنے اپنے مذاق کے موافق خیالات ظاہر کئے ہیں اور جیسا کہ میرا اعتقاد ہے اسی بنا پر ان کے اقوال عرب اور اہل عرب کی حالت اور عقاید کے متعلق باہم متناقض ہیں۔ ماسیو رینان کا بیان ہے کہ تمدن کی تمام تاریخ میں عرب جاہلیت کے زمانہ سے زیادہ کوئی خوبصورت منظر نہیں ہے۔ اس کی یہ بھی رائے ہے کہ یہ قبائل یہودی یا عیسائی مذہب رکھتے تھے اور ایک عظیم الشان مذہبی انقلاب کے لئے تیار تھے۔ لیکن ماسیو بارتھلی سینٹ ہیلر کہتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ ان لوگوں میں ایک کامل تمدن پایا جاتا تھا تو وہ اس قسم کی اخلاقی تعلیم کے کیوں محتاج ہوتے، جس کے سننے سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں مثلاً:

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ۔ (نساء ۴: ۲۳)	تم پر تمہاری مائیں حرام ہیں اور بیٹیاں اور بہنیں اور پھوپھیاں اور خالائیں اور بھتیجیاں اور بھانجیاں۔

اس مصنف کی یہ رائے ہے کہ اہل عرب ایک وحشی قوم تھی اور ان کی حالت قریباً ویسی ہی تھی جیسی یہودیوں کی اس زمانہ تک جب حضرت موسیٰ مبعوث ہوئے تھے اور اسی قسم کے احکام پاتے تھے۔

ان دونوں رایوں میں میں کسی کے ترجیح دینے پر غور کرنا نہیں چاہتا لیکن میری رائے ہے کہ دونوں میں افراط و تفریط ہے۔ عرب کی قوم تمیز سے پہلے عموماً بت پرست تھی اور وحدانیت کا اعتقاد فقط خال خال بعض طبیعتوں میں پیدا ہو چلا تھا۔ اس کے اعتقاد والے حنیفی کہلاتے تھے، جو ابراہیمی مذہب کے پیرو تھے۔ باقی عیسائی تو ان کے بہت کثرت سے فرقے تھے اور سب کے سب کسی خدا کے قائل تھے۔ پیغمبر نے حنیفوں کے مذہب کو ایک سطحی حالت میں پایا تھا، لیکن چونکہ ان کی فطرت مذہب سے لبریز تھی، اس لئے یہی خیال ان کے دل میں اعتقاد بن گیا اور ایسا اعتقاد کہ اس کی نظیر اس سے پہلے بہت کم پائی گئی تھی۔ یہ وہی مضبوط اعتقاد تھا جس نے انسانی نوع میں ایک

انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور یہ بالکل غلط ہے کہ ہم دین حنفی کے سوا اور کسی مذہب میں اس مذہب کے تعلیم یافتہ معلم کی جستجو کریں کیوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے نہ تھے۔ بلکہ جیسا کہ خود انھوں نے بار بار اقرار کیا ہے بالکل ان پڑھ تھے اور اس وصف میں ان کے معاصرین میں سے کسی نے ان سے معارضہ نہیں کیا اور یہ ظاہر ہے کہ بلاد مشرق میں یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس طرح علم حاصل کرے کہ کسی کو خبر نہ ہو کیوں کہ مشرقیوں کی زندگی پردہ خفا میں نہیں رہتی۔ جس کے علاوہ اس زمانہ میں پڑھنا لکھنا ان ممالک میں بالکل معدوم تھا اور ایک شخص کے سوا جس کا ذکر ڈی ساسے نے اپنی کتاب مطبوعہ جینیوا میں کیا ہے۔ کوئی شخص مکہ میں پڑھا لکھا نہ تھا اسی طرح اس قرینہ کی بنا پر کہ حضرت خدیجہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجارت کے کام کے لئے انتخاب کیا تھا۔ یہ نتیجہ نکالنا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پڑھے لکھے نہ تھے تو وہ تجارت کا کام ان کو کیونکر سپرد کرتیں۔ صحیح نہیں۔ عرب اور غیر عرب قوموں میں کثرت سے تجار ہیں جن کے ایجنٹ اور نائب ان پڑھ ہوتے ہیں اور باوجود اس کے اوروں کی بہ نسبت زیادہ دیانت دار ہوتے ہیں۔

غرض بیانات سابقہ سے ظاہر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کوئی آسمانی کتاب پڑھی تھی اور نہ مذہب کے متعلق مذاہب سابقہ سے رہنمائی حاصل کی تھی۔ اگرچہ عموماً مورخوں کا یہ بیان ہے کہ وہ عیسوی مذہب سے قرأت اور کتابت دونوں طریقہ پر واقف تھے۔

بے شبہ ان ماخذوں کا پتہ لگانا جن سے یہ ثابت ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیسوی یہودی یا ستارہ پرستوں کے عقائد کو زبانی سیکھا تھا۔ نہایت مفید ہوگا۔ کیونکہ قرآن اور توراۃ میں اکثر جگہ توافق پایا جاتا ہے۔ تاہم یہ بحث دوسرے درجہ کی بحث ہوگی کیونکہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قرآن مجید دیگر کتب آسمانی سے ماخوذ ہے۔ تاہم یہ مشکل سوال خود باقی رہے گی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ مذہبی روح کہاں سے آئی اور وحدانیت کا ایسا مضبوط خیال کیوں کر دل میں آیا۔ جو ان

کے جسم و روح پر چھا گیا۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اظہار نبوت سے پہلے ان پر بڑی سختیاں گذریں اور ان کو بہت سے مصائب جھیلنے پڑے کیونکہ خدا نے ان کی فطرت ہی مذہب کے لیے بنائی تھی اور یہی وجہ تھی کہ سب کو چھوڑ کر انہوں نے عزلت اختیار کی تاکہ بت پرستی اور تعدد الٰہ کی بدعت میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔ جس کو عیسائیوں نے خود ایجاد کیا تھا۔ ان دونوں مذہبوں کی نفرت ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ ان مذہبوں کا وجود کانٹے کی طرح ان کے دل میں کھٹکتا تھا۔ اسی غرض سے کہ جو عظیم الشان فکر یعنی وحدانیت کا خیال ان کے دل میں اتر گیا تھا محض اسی سے سروکار رکھیں۔ کوہ حرا میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ یہاں بیٹھ کر ان کے خیال نے دریائے فکر میں نہایت آزادی کے ساتھ جولانیاں شروع کیں۔ اس کے ساتھ وہ ہمیشہ عبادت اور تہجد میں مشغول رہتے تھے۔ اسی حالت میں کئی دن گذر گئے۔ ان مقامات کی راتیں نہایت معتدل اور خوشگوار ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ عوام میں مشہور ہے کہ ملائکہ خدا سے اجازت مانگتے ہیں کہ آسمان سے اتر کر وہ ایک دن ان راتوں کے سماں کا لطف اٹھائیں۔

اللہ اکبر: معلوم نہیں یہ چالیس سالہ شدید الذہن جوان جس کا شمار مشرقی لوگوں میں ہے جو قوت ادراک اور صرف تخیل میں فرد ہیں اور جن کا یہ کام نہیں کہ تصویریں ہی بنایا کریں، اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا اور برابر کہے جاتا تھا۔ خدا ایک ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن کو اس کے بعد تمام مسلمان ہمیشہ دہرایا کئے اور جن کو ہم عیسائیوں نے اس وجہ سے فراموش کر دیا کہ توحید کے خیال سے ہم بہت دور پڑ گئے ہیں۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال برابر اسی دھن میں مشغول رہا۔ یہاں تک کہ یہی خیال مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہو کر ان کے سامنے آیا۔ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ (اخلاص ۱۱۲: ۳-۴) عربی زبان میں مترادف الفاظ کی کثرت نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بلند خیال کے بار بار ادا کرنے میں بہت مدد دی جن کو ظاہر کرنا چاہتے تھے اور انہیں افکار اور اسی طرز پرستش سے اسلام کا یہ قبلہ پیدا

ہوا کہ لا الٰہ الا اللہ یہی اصلی اعتقاد ہے۔ اس یکتا خدا نے بے نیاز کا جو ہر عیب سے پاک ہے۔ عقل کا اس اعتقاد کو خیال میں لانا بآسانی ممکن ہے۔ یہ ایک ایسا قوی اعتقاد ہے جس پر مسلمان ہمیشہ یقین کرتے آئے ہیں اور جس کی وجہ سے وہ تمام قبائل اور اقوام میں ممتاز ہیں۔ در حقیقت انہی کے ایمان کو ایمان کہا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ان کا خود دعویٰ بھی ہے۔ یہ بالکل ناممکن ہے کہ یہ اعتقاد محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو توراۃ اور انجیل سے پہنچا ہو۔ کیونکہ وہ اگر ان کتابوں کو پڑھتے تو اٹھا کر پھینک دیتے؛ کیونکہ وہ دیکھتے کہ ان میں تثلیث موجود ہے۔ جو ان کی فطرت اور ان کے مذاق طبعی کے خلاف ہے۔ ایسے اعتقاد کا رفعت سے ان کی زبان سے ظاہر ہونا۔ ان کی زندگی کا بڑا معجزہ ہے اور فی نفسہٖ یہی آپ کی پیغمبری اور آپ کی دیانت فی الدعوت کی دلیل اعظم ہے۔

قرآن کی وحی کا مسئلہ اور بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ ارباب بحث اس کو معقول طور پر حل نہیں کر سکے۔ عقل بالکل حیرت زدہ ہے کہ اس قسم کا کلام اس شخص کی زبان سے کیوں کر ادا ہوا جو بالکل ان پڑھ تھا۔ تمام مشرق نے اقرار کیا ہے کہ یہ وہ کلام ہے کہ نوع انسانی لفظاً و معناً ہر اعتبار سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ یہ وہی کلام ہے کہ جب عتبہ بن ربیعہ نے اس کو سنا تو اس کے حسن پر حیرت زدہ رہ گیا۔ یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشاء پردازی نے عمر بن خطاب کو مطمئن کر دیا اور وہ خدا کے معترف ہو گئے۔ یہ وہی کلام ہے کہ جب عیسیٰ کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالب نے نجاشی کے سامنے پڑھے تو اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بشپ چلا اٹھا کہ یہ کلام اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ کا کلام نکلا تھا۔

عربوں کی صلح پسندی اور بے تعصبی

جب عرب ایمان قبول کر چکا اور لوگوں کے دل اسلام سے معمور ہو چکے تو اب اسلام دنیا کو ایک دوسرے لباس میں نظر آیا یعنی نرمی اور آزادی خیالات یا تو قرآن میں تشدد آمیز آیتیں نازل ہوتی تھیں یا اب پے در پے اس قسم کے احکام آنے لگے۔

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (البقرہ ۲:۲۵۶)

مذہب میں زبردستی نہیں، راستی گمراہی سے صاف الگ ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (انعام ۶:۱۰۸)

یہ لوگ خدا کے سوا جن لوگوں کو پکارتے ہیں (یعنی معبودان باطل) ان کو گالی نہ دو ورنہ جہالت سے وہ بھی خدا کو گالی دیں گے۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا۔ (مزمل ۷۳:۱۰)

اے محمد! ان کی باتوں پر صبر کر اور ان سے کنارہ کر معقول طریقے سے۔

عرب کے اسلام لانے کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت اسی طرح کی تھیں اور آپ کے خلفاء نے بھی ان کی تقلید کی۔ اس بنا پر ہم کو رابرٹسن کے اس قول کے ساتھ متفق ہونا پڑتا ہے کہ صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پیروؤں میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ انہوں نے جوش مذہب اور حسن سلوک کو ساتھ ساتھ رکھا۔ یہ جوش مذہب عرب کی فتوحات کا سبب ہوا۔ لیکن اس قسم کے سبب میں کوئی حرج نہیں۔

جب اسلام کی کامیاب فوجوں نے شام پر چھاپہ مارا اور بجلی کی طرح شمال

افریقہ پر بحر روم سے لے کر اٹلانٹک تک چھا گئے تو قرآن اپنے دونوں شہپروں کو پھیلائے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے تھا، دوں بنا پر اسلامی فوج کے طریق عمل میں کہیں ظلم کا نشان نظر نہیں آتا۔ بجز ان امور کے جن سے مفر نہیں ہوسکتا، مسلمانوں نے کسی قوم کو اس بنا پر قتل نہیں کیا کہ وہ اسلام لانے سے انکار کرتے تھے۔ گرچہ بربریوں اور مسلمانوں کی حملہ آوری کا مقابلہ کریں تو ہم یہ نہیں کہتے کہ مسلمان نقصان کم پہنچاتے تھے اور ترکی زیادہ کرتے تھے۔ مسلمانوں کو جن قوموں سے سابقہ پڑا انھوں نے ان کو تین باتوں کا اختیار دیا، اسلام یا جزیہ یا جنگ۔ ابوبکر صدیقؓ نے خالدؓ کو جب شام کی طرف بھیجا تو یہی ہدایت کی۔ یہ احکام گو نا عمل میں آتے تھے، لیکن بت پرست اس سے مستثنیٰ تھے۔ کیونکہ ان کے ساتھ اور عرب کا برتاؤ کیا جاتا تھا، جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ (۱)

بہتر ہوگا کہ ہم اس موقع پر ابوبکر صدیقؓ کے احکام اور زبور کی پانچویں کتاب میں جو ان کے محاصرہ اور لڑائیوں کے معاملہ کے متعلق ہے۔ موازنہ کریں۔ زبور میں ہے:

جب تو کسی شہر کا محاصرہ کرے تو ان پر امان پیش کرے۔ اگر وہ لوگ امان قبول کرلیں تو سب لوگ محفوظ رہیں گے۔ لیکن اگر وہ لوگ انکار اور دشمنی کا اظہار کریں تو ان کا سخت محاصرہ کر اور فتح حاصل ہونے کے بعد ہر شخص (مرد) کو قتل کر دے۔

مسلمانوں کو افریقہ اور ایشیا میں عیسائیوں کی طرف سے بہت مقابلہ پیش آیا، جس کے بعد وہ نئے مذہب کی طرف مائل ہوگئے۔

ایسے باعظمت کلیساؤں کا جیسے کہ کارتھیج کے کلیسا تھے، اسلام کے زیر اثر آ جانا ایک ایسا واقعہ ہے، جس کی وجہ ایک زمانہ دراز سے لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ اسلام نے تعصب اور سختی کا برتاؤ کیا۔ لیکن خود اس زمانہ کے معاصرین اس کی وجہ اقتضائے زمانہ کے موافق یہ بیان کرتے ہیں کہ عیسائی خدا کے غضب کے مستوجب

---

(۱) یہ مصنف کی غلطی ہے۔ اسلام نے بت پرستوں کو بھی یہی اختیارات دیے ہیں۔

تھے، اس لئے خدا نے ان کی بے دینی کی سزا دی۔ عیسائی عابدوں میں سے بعضوں نے اس خیال کی تائید میں لوگوں کو توبہ کی ترغیب دلانی چاہی۔ انھوں نے نہایت مبالغہ سے کام لیا اور عیسائیوں پر آفت وارد ہونے کی اور لوگوں کو یہ یقین دلانا چاہا کہ اسلامی فوجیں ایک آلہ ہیں، جن کے ذریعہ سے خدا نے عیسائیوں پر عذاب نازل کیا ہے۔

چونکہ اسلامی فتوحات اور کلیسا کا باہمی اختلاف، دونوں واقعات ایک ہی زمانہ میں پیش آئے، اس لئے اگر مورخوں نے دونوں کو ایک ساتھ ملا دیا تو ان پر نکتہ چینی نہیں ہو سکتی۔ خود ناقدین بھی قبول اسلام اس اطاعت و حکومت میں فرق نہیں کرتے تھے۔ لیکن یہ امر محض غلط مانا جاتا ہے کہ ان دونوں واقعات میں سے ایک کو دوسرے کا معلول قرار دیا جائے۔ ان دونوں واقعات میں نہایت خفیف اثر پذیری کا تعلق ہے۔ جس طرح فتوحات اسلام نے عیسائیوں کو ترک مذہب پر آمادہ کیا، اسی طرح کلیساؤں کے باہمی اختلاف نے اسلامی فتوحات کے لئے راستے صاف کر دئے۔

بشپ آریوسس نے حضرت عیسیٰ کے خدا ہونے سے انکار کیا تھا، اس بنا پر اس نے گویا پیغمبر عرب کے لئے قوت طلایہ کا کام دیا، کیونکہ اس سے اسلام کے لئے زمینہ صاف ہو گیا، کیونکہ اسلام بھی حضرت عیسیٰ کے متعلق یہی کہتا ہے کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیل آخر الانبیاء تھے۔ (۱)

یہ گویا فرق عداوت تھا کہ اسکندریہ کا بشپ جس کا نام آریوس تھا۔ عیسائی مذہب کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوا، یہاں تک کہ اس مذہب کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور تمام عیسائیوں پر ناامیدی سی چھا گئی۔ مقدس جیروم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ "عالم کون اس بات سے حیرت زدہ ہے کہ تمام لوگ کافر ہو گئے ہیں اور اب کسی کا یہ عقیدہ نہیں رہا کہ باپ (خدا) نے بیٹے کا جسم اختیار کر لیا تھا"۔

اگرچہ ان عیسائیوں نے جو بشپ کے پیرو تھے اس مذہب جدید کو دبا لیا، تاہم

(۱) یہاں تقریباً دو تین سطروں کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے معنی میری سمجھ میں نہیں آسکے۔

افریقہ اور ایشیا کے کلیساؤں میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا، اسلام جب لمبے لمبے قدم بڑھاتا آیا تو ان لوگوں (پیروان آریوس) نے اس کو کوئی نیا مذہب نہیں سمجھا، بلکہ عیسائی مذہب سمجھ کر اس کو قبول کر لیا۔

اسلام کی وسعت کا ایک اور بھی سبب ہے۔ یعنی قسطنطنیہ کی جابرانہ حکومت، یہ سلطنت انتہا درجہ کی ظالم تھی، حکام کا ظلم اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ لوگ جان سے عاجز آ گئے تھے، جب اسلام کا قدم آیا تو لوگوں نے اسلام کے سایہ میں پناہ لی، کیونکہ جو شخص اسلام لاتا تھا وہ ٹیکسوں اور تاوانوں سے بچ جاتا تھا اور مال مسروقہ اس کو واپس مل جاتا تھا، جو لوگ اسلام نہیں قبول کرتے تھے ان سے بھی یہی برتاؤ کیا جاتا تھا صرف جزیہ ان سے لیا جاتا تھا جس کی مقدار نہایت کم ہوتی تھی۔ یعنی آمدنی کا دسواں یا بارھواں حصہ (یہ غلط ہے، جزیہ کی مقدار بڑے سے بڑے دولتمند کے لئے بھی کبھی ۴۸ درہم سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی، جزیہ کی انتہائی تعداد تھی ۳۰ آمدنی کے حصہ سے اس کو کوئی نسبت نہ تھی، مترجم)۔

اسلام کے سایہ میں عیسائی مطمئن ہو گئے، رعایا اسلام میں کوئی شخص ان کے مذہب سے متعرض نہیں ہوتا تھا اور اصلی عیسائی اور مرتدوں میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا، یہ برتاؤ وہ تھا، جس کا خود قرآن نے حکم دیا تھا اور خلفائے اولین اس پر کاربند تھے۔ یہودی اور عیسائی ذمی کہلاتے تھے، غیر مذہب والوں کی تین قسمیں تھیں، ذمی، مستامن، حربی۔

ذمی اس کو کہتے تھے جو اسلام کے زیر حکومت ہو اور جزیہ ادا کرتا ہو، اس کو یہ حقوق حاصل تھے کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنے خدا کی عبادت کر سکتا تھا، اس کو اسلام پر مجبور نہیں کیا جاتا تھا، وہ قوانین سلطنت کا پابند ہوتا تھا اور شخصی قانون مثلاً نکاح، طلاق، وراثت میں اس کے مذہب کے موافق عمل کیا جاتا تھا، البتہ جب کسی معاملہ میں اس کا فریق ثانی مسلمان ہوتا تھا تو مذہب اسلام کے مطابق عمل ہوتا تھا۔

یہ سخت غلطی ہے کہ ذمی کے لفظ سے ذلیل اور رذیل کے معنی مراد لئے

جائیں، در حقیقت اس لفظ کے معنی امن یافتہ کے ہیں۔

مستامن اس شخص کو کہتے ہیں جو سفر میں ہو اور احکام سلطنت و قوانین
حکومت کے زیر حمایت زندگی بسر کرتا ہو۔

حربی وہ ہے، جو اس ملک میں رہتا ہے جو علانیہ اسلام کا دشمن اور حریف
جنگ ہے، یا جہاں مسلمانوں کو امن نہیں، ایسا شخص جب اسلامی شہر میں آئے اور
آمادہ جنگ ہو تو وہ قتل کردیا جائے گا، مگر اس حالت میں کہ اسلام قبول کرلے، اس
حالت کے سوا باقی سب مستامن ہیں، بشرطیکہ جزیہ ادا کریں، حضرت علی کا قول ہے کہ
جزیہ اس لیے ہے کہ ذمی کی جان و مال مسلمانوں کے جان و مال کے برابر ہوجائے۔

اس نرمی اور حسن معاملت کی وجہ سے اسلام کو ترقی ہوئی، کیونکہ ممالک
مشرق کے سلاطین کے ظلم نے تمام لوگوں کو بیزار کردیا تھا اور لوگ ان سے سخت
نفرت کرنے لگے تھے۔

اب اگر ہم ابتدائے فتح کے زمانہ کو چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف آئیں، جب
کہ اسلامی حکومت نے استقلال حاصل کرلیا تو ہم کو صاف نظر آئے گا کہ اسلام، مشرقی
عیسائیوں کے مقابلہ میں کس قدر زیادہ نرم خو اور صلح جو تھا۔

عرب نے عیسائی رسوم مذہبی کا کبھی معارضہ نہیں کیا، اہل ذمہ
نہایت آزادی سے ان پیشوایان مذہبی سے خط کتابت جاری رکھتے تھے، جو ان کے بی
حاکم تھے، [illegible] میں پوپ نے جس کا نام لیون تھا، افریقہ کے عیسائیوں کو ایک خط
لکھا، جس میں تاکید کی تھی کہ کارتھیج کے بشپ کو نادر بشپ تسلیم کریں، اس زمانہ میں
مسلمانوں اور عیسائیوں میں کامل اتحاد تھا، یہاں تک کہ گریگوری ہفتم نے [illegible]
[illegible] میں عیسائیوں کو ایک خط لکھا جس میں ان کو ملامت کی تھی کہ انھوں نے بشپ
کے دربار میں مسلمانوں کی شکایت کیوں پیش کی۔

اس غیر معمولی صلح جوئی کے ساتھ بھی جو مسلمان فاتحوں کی طرف سے مفتوحین
کے مقابلے میں عمل میں آتی تھی، عیسائی مذہب نہایت کمزور ہوتا جاتا تھا، یہاں تک

کہ شمالی افریقہ سے یہ مذہب بالکل معدوم ہوگیا۔ حالانکہ اسلام میں دعوت اسلام کے لئے کوئی فرقہ مخصوص نہ تھا، جیسا کہ عیسائیوں میں ہے۔ اگر اسلام میں بھی داعیان مذہب ہوتے تو ہم کو اسلام کی ترقی کے سبب کے دریافت کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ شارلمین اپنی لڑائیوں میں ہمیشہ پادریوں اور راہبوں کا ایک گروہ ساتھ رکھتا تھا کہ جس طرح وہ خود اپنی ان فوجوں سے شہروں کو فتح کرتا پھرتا تھا جو قیامت انگیز لڑائیاں لڑتی تھیں، اسی طرح پادری لوگوں کے قلوب اور طبائع کو مسخر کرلیں، لیکن اسلام میں نہ کوئی مذہبی انجمن ہے، نہ رسول ہیں، نہ احبار ہیں، نہ راہب ہیں، جو فوجوں کے ساتھ ساتھ رہیں۔ کوئی شخص تلوار یا زبان کے ذریعہ سے اسلام ماننے پر مجبور نہیں کیا گیا، بلکہ اسلام نے خود لوگوں کے دلوں میں گھر کرلیا اور یہ اس اثر کا نتیجہ تھا جو قرآن کی دلآویزی اور فریفتگی کا خاصہ ہے۔

بے شبہ ان لوگوں نے بھی اسلام قبول کیا، جن کی غرض دنیاوی نفع تھی، لیکن ان کی تعداد ان لوگوں کے مقابلہ میں بہت کم ہے، جو دلی اور سچی خواہش سے اسلام لائے۔ قبول اسلام میں اس لئے بڑی آسانی ہوئی کہ مذہب اسلام ایک سیدھا سادھا مذہب ہے، جس کے لئے کلمۂ توحید پڑھنا کافی ہے۔ ان باتوں کے ساتھ بھی یہ نظر نہیں آتا کہ استقلال حکومت کے بعد عیسائیوں کے کسی گروہ نے دفعتہً واحدۃً اسلام قبول کیا ہو، بلکہ یہ ضروری تھا کہ جو شخص اسلام لانا چاہے وہ قاضی کے ہاتھ پر اسلام لائے اور ایک محضر لکھے، جس میں یہ تصریح ہو کہ وہ سچے اعتقاد سے بغیر کسی دباؤ اور خوف کے اسلام قبول کرتا ہے، کیونکہ کوئی شخص تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ (یہ محضر ضمیمہ سوم میں درج ہے)

دولت بنو امیہ کے زمانے میں نہایت کثرت سے عیسائیوں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ خود خلفاء نے اس ترقی کو اس لحاظ سے پسند نہیں کیا کہ بیت المال کی آمدنی کو نقصان پہنچتا تھا۔ چنانچہ امیر معاویہؓ کے زمانہ میں، مصر میں جزیہ کی آمدنی حضرت عثمانؓ کے زمانے کی نسبت سے آدھی رہ گئی تھی، اس بناء پر خلفاء

نے قبول اسلام کی وسعت کو اس طریقہ سے تنگ کر دینا چاہا کہ نو مسلم بھی جزیہ سے معاف نہ کئے جائیں۔ چنانچہ حیان نے عمر بن عبد العزیزؒ کو خط لکھا کہ اگر یہی حالت رہی تو اس ملک کے تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ خزانہ شاہی کو سخت نقصان پہنچے گا۔ لیکن عمر بن عبد العزیزؒ نے خط پڑھ کر ایک شخص کو حکم دیا کہ حیان کے پاس جا کر اس کو تین درّے لگائے اور اس سے کہے کہ اس سے بڑھ کر کیا سعادت ہوگی کہ تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں۔ خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس لئے بھیجا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کریں نہ اس لئے کہ خراج اور ٹیکس لگائیں۔

مسلمان اگر بیت المال کے خالی ہو جانے سے خوف کرتے تھے تو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں الجزائر (مقبوضہ فرانس) میں ٹیکس کا بار زیادہ تر مسلمانوں پر ڈالا جاتا ہے۔ فرض کرو کہ تمام مسلمان عیسائی ہو جائیں اور ان کو وہ تمام حقوق دے دئے جائیں جو عیسائیوں کو حاصل ہیں تو آمدنی کے گھٹ جانے سے ہم کو سخت پریشانی ہوگی۔

اسپین میں مسلمانوں نے عیسائیوں کے ساتھ اور بھی زیادہ نرمی کا برتاؤ کیا۔ یہاں تک کہ ان کی جو حالت قدیم جرمنیوں کی سلطنت کے زمانے میں تھی، اس سے کہیں بڑھ کر وہ خوش حال ہو گئے۔ پروفیسر ڈوزی لکھتا ہے کہ مسلمانوں کی فتح نے اسپین کو کچھ نقصان نہیں پہنچایا۔ ابتدائے فتح کے زمانے میں جو برہمی اور اضطراب پیدا ہوا تھا، وہ استقلال سلطنت کے بعد جاتا رہا۔ مسلمانوں نے تمام باشندوں کے مذہب، شریعت اور عدالت کو قائم رکھا۔ ان کو ملکی عہدے دئے۔ یہاں تک کہ بعض خود خلفاء کے دربار میں ملازم تھے۔ اکثروں کو فوجی عہدے دئیے گئے۔ اس رحیمانہ سیاست نے اسپین کے عقلاء کو مسلمانوں کی طرف مائل کر دیا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں کثرت نکاح اور رشتہ داریاں ہو گئیں۔ سینکڑوں عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہنے کے ساتھ عرب کی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہو گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے عربی زبان اور عربی علوم و فنون کی تحصیل شروع کی۔ بشپ اور پادری ان کو ملامت کرتے تھے کہ وہ گرجا کے گیت چھوڑتے جاتے اور مسلمانوں کا شعار اختیار کرتے جاتے ہیں۔

اس زمانہ میں مذہبی آزادی انتہا درجہ کو پہنچ گئی تھی، اسی بنا پر جب یورپ نے یہودیوں پر جبر کرنا چاہا تو انہوں نے خلفائے اندلس کے سایے میں پناہ لی، بخلاف اس کے جب چارلس نے سرقسطہ پر قبضہ کیا تو حکم دیا کہ یہودیوں اور مسلمانوں کی تمام عبادت گاہیں برباد کر دی جائیں، ہم کو معلوم ہے کہ صلیبی لڑائیوں کے زمانہ میں عیسائی جہاں پہنچے انہوں نے مسلمانوں اور یہودیوں کو ایک طرف سے قتل کر دیا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ یہودیوں نے اگر کوئی ملجا و ماویٰ پایا تو مسلمانوں ہی کو پایا اور آج دنیا میں جو یہودی موجود ہیں، یہ مسلمانوں ہی کی عنایت ہے۔ الفیگر شاہین نے اس کی وجہ جو یہ بیان کی ہے کہ مسلمان اور یہودی نسب میں، زبان میں، مذہب میں متحد ہیں، یہ غلط ہے۔

مسلمانوں نے اندلس کے عیسائیوں سے صرف جزیہ طلب کیا، جو معمولی عام تھا، اس موقع پر ایک لطیفہ کا بیان کرنا موزوں ہوگا۔ جس کو ایک عرب مؤرخ نے لکھا ہے اور جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جزیہ کے بارے میں ان کا کیا خیال تھا اور یہ کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں کیسے تعلقات تھے۔

دولت فرانس اور اسلام

اسلام اپنی قوت اور زندگی پر یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ اس نے وسط افریقہ، حبش کے شرقی حصہ، سوڈان، سینیگال ان تمام مقامات میں بت پرست قوموں کو قرآن کے علم کے نیچے مجتمع کر دیا جو اس کی عجیب و غریب طاقت اور حیرت انگیز رفتار کی دلیل ہے، پچاس برس ہوتے ان ممالک میں مہدی اور امام جنجوب کی سلطنتیں اس نمونہ کے موافق قائم ہو گئی ہیں جو مذہبی حکومت کی تصویر ہے اور جس کو پیغمبر اسلام نے پیش نظر رکھا تھا، اسی طرح اس کے مقابل جانب ایک اور تیسری حکومت شمالی افریقہ میں قائم ہوئی ہے، جو عیسوی مذہب کے حملوں کا کامیابی سے مقابلہ کر رہی ہے، یعنی مراکو کی سلطنت گو اس ملک کی بعض قومیں اس سلطنت کی مطیع نہیں ہیں، تاہم اگر

کوئی وقت آئی تو کچھ شبہ نہیں کہ تمام مغرب میں یہ سلطنت حامی اسلام ثابت ہوگی۔

یہ وہ ممالک ہیں، جہاں مذہب اور پالٹکس دونوں کی باگ ایک شخص کے ہاتھ میں ہے، جیسا کہ قرآن کی تعلیم ہے۔ یہ وہ ممالک ہیں، جن کے لئے اہل کلیسا نے دارالاسلام کا لقب خاص کر دیا ہے اور یہ وہ لقب ہے جس کی ہوس اور مصر و ترک کے دل میں ہے، لیکن بے فائدہ، کیونکہ ان مقامات میں اصلی مذہب کو مغربی تمدن نے غبار آلود کر دیا ہے۔ لیکن ابھی ہم ان ممالک کی حالت سے بحث نہیں کرتے بلکہ ہم صرف الجیریا اور فرنچ افریقہ سے بحث کرتے ہیں۔ جہاں عیسوی مذہب اور عیسوی سلطنت اسلام سے ٹکرا رہی ہے۔ یہ وہ ممالک ہیں جن کو مسلمان دارالحرب یعنی دار اعداء کہتے ہیں، یہاں اسلام کی جو حالت ہے، اس کے متعلق تین حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے۔

کیا انجیل نے قرآن میں کوئی تبدیلی پیدا کی ہے۔

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام ہمیشہ اپنی حالت کو قائم رکھے گا تو یہ سوال ہے کہ آیا عیسائیوں اور مسلمانوں میں کسی قسم کا ربط پیدا ہوا ہے، جس سے نتیجہ یہ امید ہو کہ دونوں میں امتزاج تام پیدا ہو جائے گا۔

اور کیا یہ خوف ہمیشہ قائم رہے گا کہ مسلمان کسی دن جہاد پر آمادہ ہو کر ان ممالک پر غالب نہ آجائیں۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کی طرف مائل نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی۔ یہاں تک کہ ان کو اپنی زبان میں کوئی لفظ نہیں ملتا۔ جس کے ذریعہ سے وہ ایسے شخص کے اوصاف بیان کر سکیں، جن مسلمانوں نے فرنچ مذہب اختیار کر لیا ہے، چونکہ ان میں بھی ارتداد کی بو ہے، اس لئے مسلمان ان کی نسبت بھی متحیر ہیں کہ ان کو کس نام سے پکاریں، چنانچہ انھوں نے مجبوراً فرنچ زبان کا ایک لفظ انتخاب کیا ہے، جس کو وہ ان لوگوں کے حق میں استعمال کرتے ہیں۔

یہ لفظ متورنی ہے، جس کے معنی مرتد کے ہیں۔ اگر کوئی عیسائی کسی

مسلمان کو عیسائی بنانا چاہے تو اس وقت کی کیفیت کا بیان کرنا سخت مشکل ہے۔ اس کا اندازہ کسی قدر اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ جب کسی عیسائی کو بت پرست بنانے کا ارادہ کیا جائے۔ لیکن یہ تشبیہ بھی پوری نہیں۔ مسلمان کا عیسائی ہونا اس وجہ سے سخت مشکل ہے کہ وہ عیسائیوں کو سخت ذلیل سمجھتا ہے۔ اس کو اپنے موحد ہونے پر بے انتہا ناز ہے۔

مسلمانوں کا یہ یقین ہے کہ ان کا مذہب عیسائیت سے اس قدر افضل ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ عیسائی اسلام کی صحت کا قائل نہ ہو۔ یہاں تک کہ ہم عیسائی جو مسلمانوں سے بے تعصبانہ ملتے ہیں تو مسلمان سمجھتے ہیں کہ یہ اسی خیال کا اثر ہے۔ مسلمان کو اس پر ناز ہے کہ وہ خدا کی عبادت ذہنی طریقہ سے کرتا ہے۔ اس کے مذہب کو ظاہری ملابستیں اور سرو سامان درکار نہیں۔ اس کو عیسائیوں کے مذہبی جلسوں میں بت پرستانہ عبادتیں نظر آتی ہیں۔ مسلمان عیسائیوں کو اہل کتاب کہتے ہیں۔ لیکن ان کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے بلکہ اکثر تو عیسائیوں کو بت پرستوں سے بدتر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ خدا نے جو مذہب ان پر اتارا تھا اس کو عیسائیوں نے جان بوجھ کر بدل دیا۔

مذہب عیسوی کے متعلق مسلمانوں کے یہ خیالات ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خیالات عیسائیت کی ترقی کے کس قدر سد راہ ہیں۔ پادریوں کو مختلف قوموں کے عیسائی بنانے میں ہر جگہ کامیابی ہوئی۔ وحشی قوموں میں بھی اور شائستہ قوموں میں بھی۔ لیکن مسلمانوں میں وہ جہاں گئے۔ ان کو کامیابی کا دروازہ ہر طرف سے بند ملا۔ بت پرست قومیں جب مہذب ہوتیں تو انھوں نے اپنے وحشیانہ مذہب کو فوراً چھوڑ دیا۔ کیونکہ وہ ان کی عقل کے موافق نہ تھا۔ ان کی شائستگی نے ان کو آمادہ کر رکھا تھا کہ وہ خالص عقلیات کو قبول کرلیں۔ اس لئے جب پادریوں نے منطقی دلائل سے اپنا مذہب ان کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے فوراً قبول کرلیا۔ مقدس پولوس کو اکثر بت پرستوں سے سابقہ پڑا تھا۔ جو اپنے خدا کو اس لئے چھوڑ دیتے تھے کہ ان کا جھوٹا ہونا ان پر ثابت ہو جاتا تھا۔ یونانی بھی اکثر دلیل اور برہان کی طرف مائل نظر آتے تھے۔ وحشی بت پرستوں کا

عیسائی ہونا اس لئے آسان تھا کہ پادریوں کو ان پر علمی تفوق حاصل تھا۔

لیکن یہ کس پادری کے امکان میں ہے کہ کسی مسلمان کو اس کے مذہب کی طرف سے متزلزل کردے اور اس چیز کی اس کی عبادت کرائے، جس کو وہ حقیر سمجھ رہا ہے یا اصل مذہب کو اس کی نظر میں بے وقعت کردے، جس کو وہ مقتضائے عزت خیال کرتا ہے۔

مسلمانوں کے دل میں عیسائیت کے خلاف جو خیال جم گیا ہے، وہ ابدی ہے۔ پادری اس کو کیوں کر اس کے دل سے دور کرسکتے ہیں۔ وہاں مالیکہ مسلمان اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کرنا بھی پسند نہیں کرتا اور نہ کسی قسم کی بحث برداشت کرسکتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان استدلال اور حجت سے عیسائیت کے قبول کرنے پر آمادہ نہیں تو یہ کیا ممکن نہیں کہ زور شمشیر سے کام لیا جائے، اس کا جواب یہ ہے کہ فرنچ ہی فتح کے وقت بھی مسلمانوں کو عیسائی نہیں بنا سکتے تھے، جیسا کہ شارلمین نے کیا تھا، اس لئے مجبوراً کلیسا کو سکوت سے کام لینا پڑا، جیسا کہ آج تمام قوموں نے مسالمت کا پہلو اختیار کرلیا ہے، لیکن کلیسا اس مسالمت کو مذہب عیسوی کا کوئی مسئلہ مسلمہ نہیں قرار دیتا ہے بلکہ اس سے صریح انکار کرتا ہے۔

الجیریا میں جو معاہدہ ہوا اس کی رو سے کسی پر مذہبی جبر کرنا بالکل ممنوع ہے۔ کیونکہ فرنچ گورنمنٹ نے جنرل بوساں کے توسط سے معاہدہ کیا تھا کہ اہل عرب کے مذہب سے تعرض نہیں کیا جائے گا اور اس کی عزت کی جائے گی۔ اس معاہدہ کے خلاف بطور استثنا کے ایک واقعہ پیش آنے کے قریب تھا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۶۸ء میں الجیریا کے بشپ کو مذہبی حمیت کا جوش پیدا ہوا اور اس نے چاہا کہ بہت سے مسلمانوں کو عیسائی بنالے، چنانچہ الجیریا کے عظیم الشان قحط کے بعد اس نے بہت سے یتیموں کو اس غرض سے جمع کیا۔ لیکن جنرل مکموہن نے جو الجیریا کا گورنر تھا بشپ کی مخالفت کی اور اس کوشش کو اس بنا پر چلنے نہ دیا کہ یہ معاہدہ کے خلاف ہے۔

ایک عجیب متناقض بات یہ ہے کہ الجیریا میں آج ایسے لوگ بھی موجود

ہیں، جن کو اس پر افسوس ہے کہ یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا گیا، لیکن یہی لوگ جو
پایۂ تخت (فرانس) میں ہوتے تو ان لوگوں کی صف میں کھڑے ہوتے، جو بڑے زور
سے اس بات کے حامی ہیں کہ تمام مذہبوں کو آزاد رہنا چاہیے، گویا کہ وہ اسی سلطنت
سے آرزومند ہیں جو ایک طرف تو غیر مذہب کو زر و مال کی دلفریبی سے متنفر کرنے کی
کوشش کرے اور دوسری طرف خود مسلمانوں سے جنگ کی تیاری کرے، اگر کوئی
چالاک پادری ہمت کر کے ابتداء سے زیادہ پیچ کھڑا ہوتا اور اس کے اس مشن کا مزے
سلطنت میں سے کوئی ایسا پرجوش مبصر ہوتا، جس کو خود بھی عیسائی مذہب کی اشاعت کی
طرف توجہ ہوتی یا دلفریب عورتوں کے ذریعہ سے مذہبی اشاعت کی طرف اسے التفات
دلایا جاتا اور ان سے جاہ و منزلت کا بھی اقرار کیا جاتا تو بہت آسانی سے ہزاروں عرب
اپنے اپنے مذہب کو خیرباد کہہ کر فرانسیسی مذہب کے پیرو بن جاتے، مسلمانوں کا گمان
کے اشارہ سے عیسائی مذہب کی مخالفت اور کسی وجہ سے ان کا متاثر ہونا ہی وہ
سبب ہیں جو عیسائیت کو اسلام میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتے، گو کہ کیتھولک
مشنری نے پہلے ہی یہ سمجھا دیا تھا کہ اس وعظ و نصیحت سے مسلمانوں کے قلوب عیسائیت
کی طرف مائل نہیں ہو سکتے، مگر باوجود ان دقتوں کے انھوں نے اپنے مقصد سے کنارہ
کشی نہ کی اور نہ انھوں نے جد و جہد سے ہمت ہاری اور نہ اسلام کے شکست دینے کی
دشواریوں کا خیال کر کے ان کی ہمتیں پست ہوئیں، جہاں پہنچے اپنے مقصد میں
کامیاب ہونے کی تدبیریں کیں، فقراء اور مساکین کی مالی امداد کی، چھوٹے بچوں میں
تعلیم پھیلائی، بیماروں کی خدمتیں کیں، مسٹر مرچاندیا لکھتے ہیں کہ انھوں نے باوجود ان
تمام احسانات کے ان کے مذہب میں کبھی دست اندازی نہ کی، بلکہ انھوں نے اپنا
مقصد ان کو مذہبی خدمت سے علیحدہ رکھنا قرار دیا، یہ غرض ان کا اب یہ خیال تھا کہ اگر
ہم تبلیغ کو عرب میں شائع نہ کر سکے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ سلطنت فرانس کے
اقتدار کو ان لوگوں میں کسی اور ہی عمدہ طریقے سے پھیلا سکیں گے اور ان احسانات
کے ذریعہ سے ان کے دلوں میں سلطنت سے ہمدردی کا بیج بو سکیں گے

ہونے کی کیا وجہ ہے؟ ماسپوہ وسٹ جو ایک بڑا متکلم شخص ہے، اس کی بھی یہی رائے
ہے کہ سب سے پہلے جو اخلاقی شریعت خدا نے نازل کی وہ لوگوں کے حالات، اخلاق
اور زمانہ کی ضرورتوں کے موافق تھی۔ مختلف قوموں کے اخلاق میں ایک نقص پایا جاتا
ہے جو ان کی اصلی فطرت میں موجود ہے اور جس کی تلافی ابد تک نہیں ہو سکتی یعنی
کثرت شہوت، بے شبہ یہ ایک اخلاقی عیب ہے، لیکن بہرحال جسم کی قوت اور
صحت کی دلیل ہے۔ مشرق کے مردوں میں مغرب کی بہ نسبت زیادہ قوت اور جوش
پایا جاتا ہے۔ اس لئے بعض علمائے علم طبائع الامم کی رائے ہے کہ چونکہ مشرقی لوگوں
میں غایت درجہ کی قوت پائی جاتی ہے، اس لئے تعدد ازدواج ان قوموں کے لئے
ایک ضروری چیز ہے۔

عجائبات قدرت جن کے خیال سے عقل حیرت زدہ ہو جاتی ہے، ان میں
ایک یہ بھی ہے کہ مغرب میں خدا متعدد ہیں، لیکن بیوی صرف ایک۔ بخلاف اس کے
مشرق میں خدا ایک ہے اور بیویاں متعدد۔ متعدد خدا اور ایک جورو اہل مغرب کے
مناسب ہے اور متعدد جورو اور ایک خدا اہل مشرق کے لئے موزوں ہے۔

چونکہ اہل مغرب و اہل مشرق کے مذہب، تمدن اور قومیت میں کلیۃً
مختلف ہے، اس لئے ہم مغربی لوگ قرآن کے احکام کو جو متعدد تعدد ازدواج سے
متعلق ہیں اچھی طرح کبھی نہیں سمجھتے۔

ایک بڑا ضروری پہلو جس کو محققین نے ہمیشہ نظر انداز کر دیا ہے یہ ہے کہ
تعدد ازدواج عرب کی قدیم عادت ہے، جو اسلام سے بہت پہلے بھی موجود تھی۔ عرب
میں تعدد ازدواج صحابہ کے وجود پر مقدم ہے، اس لئے پادری بدوغلی کا یہ قول محض غلط
ہے کہ تعدد ازدواج اسلام کے ساتھ پیدا ہوا، یہ قطعی ہے کہ قبائل عرب جو اسلام لائے وہ
اسلام سے پہلے بھی اسی طریقہ پر تھے جیسا کہ آج حبشی قوموں کا حال ہے، جو گویا اسلام
کی طرف مائل ہیں۔ قرآن مجید میں جس حد تک تعدد ازدواج ہے، قبائل عرب اور
سوڈان میں اس سے کہیں زیادہ رواج تھا۔ قرآن مجید میں صرف چار بیویوں کی اجازت

ان علماء نے مسند میں یہ روایت پیش کی ہے کہ خلیفہ منصور اپنی بیوی کو حد سے زیادہ چاہتا تھا اور اس بنا پر اس نے دوسری شادی کا ارادہ نہیں کیا۔ لیکن جب چند برس عیش و عشرت سے گذری تو اس کو جدت کی ہوس ہوئی اور دوسری شادی کرنی چاہی۔ منصور کی بیوی کو یہ حال سن کر سخت رنج ہوا اور اس نے کہا کہ ایک سے زیادہ شادی ناجائز ہے۔ منصور نے امام ابو حنیفہ کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ مسلمان کے لئے کتنی بیویاں جائز ہیں؟ امام صاحب بولے کہ چار۔ منصور نے اپنی بیوی کی طرف (جو پردہ سے سن رہی تھی) دیکھا اور بہ آواز کہا کہ امام صاحب کی رائے سنی۔ امام صاحب نے یہ دیکھ کر فرمایا کہ۔ لیکن منصور کو ایک سے زیادہ شادی جائز نہیں۔ منصور نے پوچھا کیوں؟ امام صاحب نے کہا تم نے اپنی بیوی کی طرف جس انداز سے دیکھا اور جس طرح گفتگو کی، اس سے میں قیاس کرتا ہوں کہ تم اس کے ساتھ عدل نہیں کر سکتے اس لئے میں حکم دیتا ہوں کہ اسی پر قناعت کرو۔ (۱)

مجھ کو معلوم نہیں کہ منصور نے امام ابو حنیفہ کے اس حکم کی اطاعت بھی کی یا نہیں، جو لوگ تعدد ازدواج کی خواہش ظاہر کرتے ہیں ان کی حالت منصور سے مشابہ ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ازدواج میں عدل نہیں ہو سکتا، اسی بنا پر بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ تعدد کے ساتھ اس قسم کے مقدمات پیش ہوتے ہوں، لیکن نان و نفقہ کے لحاظ سے یہ حالت نہیں ہے۔

تعدد ازدواج کو جن چیزوں نے روک رکھا ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ متعدد بیویوں کی کفالت نہیں ہو سکتی۔ مشرق میں تعدد ازدواج، علامت دولت مندی میں داخل ہے اسی بنا پر اس سے صرف دولت مند لوگ متمتع ہوتے ہیں اور یہ امر گویا دولت مندی کا ایک لازمی نشان کیا جاتا ہے، جیسا کہ قدیم عرب لوگوں میں قبول تھا اور چونکہ مسلمان اختلاف حالت کو نہایت رضامندی اور حسن اعتقاد کے ساتھ قبول کرتے ہیں، اس لئے فقراء کو امراء کے تعدد ازدواج پر رشک نہیں پیدا ہوتا، جس طرح وہ امراء کی اور امتیازی باتوں پر رشک نہیں کرتے۔ وہ قرآن مجید کے تمام احکام کا جس طرح ادب

(۱) یہ روایت سیرۃ النعمان حصہ اول میں [illegible] پر بھی ہے۔ [illegible] طبع [illegible]

کم ہوتے ہیں جو شادی سے محروم ہوں، بخلاف لاکھ ہا مردوں کے کہ تا عمر شادی نہیں کرتے
ہیں اہل مشرق تجرد [شادی نہ کرنا] سے بالکل ناواقف ہیں۔ یہ معصیت تمدن ہم نے
سے وہاں کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تجرد سے سخت نفرت کرتے تھے اور یہ
فقرہ اکثر فرماتے تھے کہ "اسلام میں رہبانیت نہیں ہے"۔ ایک دفعہ آپ نے فرمایا کہ
جورو والے کی ایک ساعت بے شادی نہ کرنے والوں کی نماز سے بہتر ہے۔ (یہ حدیث
خدا جانے کس نے نقل کر دی ہے)

ناظرین کو تقریرات بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ جو لوگ تعدد ازدواج کے
نقصانات بیان کرتے ہیں، انھوں نے اگر غلط بیانی نہیں کی ہے تو کم از کم مبالغہ ضرور
کیا ہے۔ پادری مذکور کا یہ بیان بالکل غلط ہے کہ مشرق میں جو شرمناک بداخلاقیاں
پھیلی ہیں، تعدد ازدواج کی بدولت ہیں، بلکہ یہ سچ ہے کہ اس رسم نے ان برائیوں کو کم
کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ مشرق میں یہ برائیاں مغرب
سے زیادہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام پر یہ داغ ان یورپین سیاحوں نے لگایا ہے، جن
کی عادت ہے کہ بغیر تحقیق کے جزئی واقعہ سے کلیات بنا لیتے ہیں۔ اگر یہ تسلیم بھی ہو
تو ان کو اپنی تصنیفات کے لئے کچھ مسالا ہی نہ ملے۔ شرمناک برائیاں ہر قوم میں ہوتی
ہیں، پیرس، لندن، برلن میں یہ برائیاں مشرق سے زیادہ ہیں۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ
پیغمبر اسلام نے ان کو بڑی سختی سے حرام قرار دیا ہے اور ان کو معمولی گناہ نہیں قرار
دیا ہے، جیسا کہ بعض لوگ اس آیت سے استنباط کرتے ہیں "وَالَّذَانِ يَأْتِيَانِهَا
مِنْكُمْ فَآذُوهُمَا فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا إِنَّ اللَّهَ كَانَ تَوَّابًا
رَحِيمًا۔" [نساء: ۱۶]

آیت مذکورہ سے یہ استنباط کرنا کہ شارع اسلام نے بدکاری کو ایک معمولی
گناہ قرار دیا ہے، آیت کے معنی بدل دینا ہے۔ اس کے علاوہ اس مضمون کے متعلق
قرآن میں صرف یہی ایک آیت نہیں ہے، بلکہ اور بہت سی آیتیں ہیں۔ مثلاً سورہ
اعراف کی یہ آیت: وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ

گئے، عورتوں پر آپ کے بہت سے احسانات ہیں، قرآن میں عورتوں کے حقوق کے متعلق بہت سی مستقل آیتیں ہیں۔ بعض آیتوں میں بیان ہے کہ عورتوں سے کس قسم کے تعلقات ہونے چاہئیں۔ بعض میں یہ تفصیل ہے کہ کس حشمت و وقار سے ان سے معاملہ کرنا چاہئے۔

اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَطَعَامُ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ حِلٌّ لَّهُمْ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَا اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ وَلَا مُتَّخِذِيْ اَخْدَانٍ۔ (مائدہ: ۵)

آج تمہارے لئے پاک چیزیں حلال کر دی گئیں اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لئے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لئے اور مسلمان عفیفہ عورتیں اور اس قوم کی عفیفہ عورتیں جن پر تم سے پہلے کتاب نازل ہو چکی ہے۔ جب کہ تم ان کے مہر ادا کر دو اور عفت مقصود ہو نہ عیاشی اور داشتہ بنانا۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۔ (نور ۲۴: ۳۰)

مسلمانوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور نفس سے بچے رہیں، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی ہے اور خدا ان کے کاموں سے واقف ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ۔ (مومنون ۲۳: ۵)

وہ مسلمان کامیاب ہیں جو نماز میں خشوع کرتے ہیں اور بے ہودہ باتوں سے بچتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور پاک دامن رہتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو بہت سے ایسے احکام دیئے جن میں شہوت رانی سے روکا اور عفت و عصمت کی تاکید کی۔ آپ نے حکم دیا کہ شوہر کو بھی عورت کا صرف چہرہ اور ہاتھ دیکھنا جائز ہے زیادہ نہیں، عورت کو نظر

ڈال کر دیکھنا بھی حرام ہے۔ انجیل میں ہے کہ "جو شخص کسی عورت کو نظر شہوت سے دیکھتا ہے، وہ دل سے زنا کرتا ہے۔" مسلمانوں کا مقولہ ہے کہ آنکھ کا زنا ظاہری زنا سے زیادہ بڑا ہے۔ ان احکام نے بدنظری کو زنا کے برابر قرار دے دیا اور ان کی پابندی صرف مسلمان کر سکتے ہیں، جن کی عورتیں پردہ میں رہتی ہیں۔

آیات مذکورہ قرآن سے معلوم ہوگا کہ پیغمبر کو ان خرابیوں کے روکنے کا کس قدر خیال تھا۔ جو عشق و ہوس سے پیدا ہوتی ہیں، یہ چند نصیحتیں اس غرض سے تھیں کہ اولاد و ازدواج والے امن و راحت سے رہیں، گو انجیل میں اس سے زیادہ سخت احکام ہیں۔ لیکن ان پر صرف وہ لوگ عمل کرتے ہیں، جن کو خدا نے کمالات اخلاقی میں ممتاز کیا ہے اور وہ بہت کم ہیں، باقی عام لوگ تو اخلاقی حیثیت سے ان کو دوسری قوموں پر کچھ ترجیح نہیں۔ بخلاف اس کے قرآن کے احکام نرم ہیں، عام مسلمان ان کا لحاظ رکھتے ہیں اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ قرآن میں صفائی اور عصمت کی تاکید ہے۔ مسلمان اس پر کاربند ہیں اور اسی وجہ سے ان کے اخلاق ممتاز ہیں، ان باتوں نے ان کی طبیعتوں میں متانت اور وقار پیدا کر دیا ہے، اگر اس قسم کے احکام نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ مسلمان بھی شہوت پرست بن جاتے جیسا کہ آج کل تہذیب یافتہ قوموں کا حال ہے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں میں غیرت و حمیت کے لحاظ سے آسمان و زمین کا فرق ہے۔ مسلمان جب یورپ کے اخبارات پڑھتا ہے، یورپین عورتوں کو ننگے لباس میں ناچتے دیکھتا ہے، رقص کے جلسوں میں بے حیائی کے ساتھ بازو کھولے ہوئے دیکھتا ہے اور اس قسم کے نظارے اور تفریحی جلسوں میں شریک ہوتا ہے تو اس کی نظر پر زد لگتی ہے۔ میں نے ایک دن وزیر مصطفیٰ کے گھر میں شیوخ عرب کو دیکھا۔ جن کے پاکیزہ اخلاق و عادات ان کے سر کے تاج اور تمغہ امتیاز تھے، وہ اس لئے بلائے گئے تھے کہ ان کی شرکت سے جلسہ کی شان بڑھے۔ ان کے سامنے عیسائی عورتیں مردوں کی بغل میں ہاتھ ڈالے سینے کھولے ہوئے تھرکتی پھرتی تھیں، یہ شیوخ ان

کی طرف سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کو یہ تسلی خیال ہوتا تھا کہ وہ کسی تفریحی جلسہ میں شریک ہیں۔ بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک ایسا تماشا گاہ ہے۔ جس میں شہوت پرستی کو بالکل آزادی دے دی گئی ہے اور چہروں سے شرم کی نقاب اٹھا دی گئی ہے۔ اس لئے ہر شخص جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جیسا کہ سال میں ایک دن حبشی اور بعض اور کمینہ قوموں میں اس قسم کی بیہودگیوں کا رواج ہے۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ جلسہ میں وہ معزز افسر شریک ہیں۔ جن کے وہ ماتحت ہیں تو ان کو اپنے خیال سے باز آنا پڑا اور سمجھے کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہیں یہ اصلی حالت ہے اور اہل یورپ کا یہ عام معمول ہے۔ اس وقت ان کو اپنی شریعت کے احکام یاد آئے اور جب انہوں نے اس شرمناک منظر کا ان احکام سے مقابلہ کیا تو دفعتہً قرآن مجید کی عظمت ان کے دلوں میں بڑھ گئی۔ جس میں یہ احکام ہیں۔

قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ۔ (نور ۲۴: ۳۱)

مسلمان عورتوں سے کہدو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنے ناموس کی حفاظت کریں اور اپنی آرائش نہ دکھلائیں بجز اس حصہ کے جو خود کھلا رہتا ہے اور اپنے دوپٹے اپنے گریبانوں پر ڈال لیں۔ (الیٰ آخرہ) (۱)

(۱) یہ پوری آیت نقل کرنے کے بعد مصنف نے اس مضمون کی اہم بحث بھی نقل کی ہے۔

مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں کر رہنا چاہیے۔

مسلمانوں نے چار دانگ عالم میں بارہ تیرہ سو برس تک حکومت کی، حکومت کا آغاز خود بانی اسلام کے زمانہ میں ہوا اور آج تک بیسیوں اسلامی حکومتیں قائم ہیں۔ سیکڑوں غیر قومیں ان کی محکوم ہوئیں، ان اسباب سے یہ بدیہی ہے کہ اسلام نے غیر مذہب والوں پر حکومت کرنے کے دستور اور آئین مفصل منضبط کئے ہوں گے۔

لیکن اسلام کو محکوم ہو کر بہت کم رہنا پڑا، اس لئے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس حالت کے متعلق حدیث سے، فقہ سے، تاریخ سے ہم کو کوئی ہدایت نہیں مل سکتی اور فقہ کا یہ حصہ بالکل اچھوتا رہ گیا۔

چونکہ یہ نہایت سخت غلط اور ناک غلطی ہے، اس لئے ہم تفصیل سے بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں اس کے متعلق کافی قواعد اور احکام موجود ہیں اور حدیث، فقہ، تاریخ سب اس قسم کے مسائل اور واقعات سے لبریز ہیں۔

اس مسئلہ کے متعلق اصل میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کوئی غیر مذہب حکومت مسلمانوں کے ملک اور زمین پر قابض ہو جائے تو:

۱۔ یہ قبضہ حقیقی ہوتا ہے یا غاصبانہ۔

۲۔ مسلمانوں کو حکومت کی اطاعت فرض ہوتی ہے یا نہیں۔

فقہ میں اس کا ایک مستقل باب ہے، جس کی سرخی یہ ہے باب استیلاء الکفار اس کے ذیل میں یہ حکم ہیں۔

وان غلبوا علی اموالنا — اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر غالب آ جائیں

واحرزوھا بدارھم ملکوھا — اور اس کو اپنے گھر میں جمع کریں تو وہ اس کے مالک ہو جائیں گے۔

ویجب علینا اتباعھم (۱) — اور ہم پر ان کی اطاعت فرض ہوگی۔

چونکہ اسلامی احکام کی اصلی بنیاد قرآن اور حدیث ہے اس لئے فقہی روایتوں سے پہلے ہم قرآن و حدیث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

قرآن مجید میں ان صحابہ کو جو دولت مند تھے اور اپنی دولت چھوڑ کر ہجرت کر کے چلے آئے تھے اور ان کے مال و دولت پر اہل مکہ نے قبضہ کر لیا تھا، خدا نے فقیر فرمایا ہے "لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ" (حشر ۵۹:۸) اس سے فقہا نے یہ استدلال کیا ہے کہ جب کفار نے ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا تو وہ اس کے حقیقی مالک ہو گئے، اسی بنا پر صحابہ کو خدا نے فقیر فرمایا، شاید کسی کو خیال ہو کہ چونکہ صحابہ کا قبضہ جاتا رہا تھا، اس لئے خدا نے ان کو فقیر کہا، لیکن ایسے شخص کے لئے جو گھر سے نکل آئے اور اس کے مال و اسباب پر اور لوگ قابض ہو جائیں اصطلاح شرع میں ایک دوسرا لفظ موجود ہے یعنی ابن السبیل۔

چنانچہ شرح وقایہ میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ قبضہ کی حالت میں کفار بھی حقیقی مالک ہو جاتے ہیں، یہ استدلال کیا ہے۔

لقوله تعالى للفقراء المهاجرين سماهم فقراء فدل على ان الكفار ملكوا اموالهم التي هاجروا عنها ومن لا يصل الى ماله ليس فقيرا بل هو ابن السبيل — کیونکہ خدا نے فرمایا ہے للفقراء المہاجرین اس آیت میں خدا نے مہاجرین کو فقیر کہا، اس سے معلوم ہوا کہ کفار صحابہ کے مال کے حقیقی مالک ہو گئے تھے کیونکہ جو شخص اپنے مال کا مالک ہو اور صرف اس کا قبضہ اٹھ جاتا ہے تو اس کو فقیر نہیں بلکہ ابن السبیل کہتے ہیں۔

---

(۱) در مختار کی شرح تنویر الابصار کے حاشیہ پر علامہ طحطاوی نے "یجب
[illegible]

فقہاء کے نازک اور دقیق استدلال کی ہم داد دیتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس قدر موشگافی اور دقیقہ سنجی کی ضرورت نہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس قسم کا واقعہ پیش آچکا تھا اور اس طرز عمل سے صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ مسلمانوں کو غیر مذہب کی حکومت میں کیونکر رہنا چاہئے؟ مکہ میں جب مخالفوں نے مسلمانوں کو حد سے زیادہ ستانا شروع کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ لوگ ہجرت کرکے حبش ابی سینیا کو چلے جائیں۔ چنانچہ بہت سے صحابہ جن میں حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ بھی تھے۔ (۱) حبش میں چلے گئے۔ حبش کا بادشاہ عیسائی تھا، جس کو اہل عرب نجاشی کہتے تھے، صحابہ جب حبش میں آئے تو اتفاق سے چند روز بعد کسی بادشاہ نے اس ملک پر چڑھائی کی اور نجاشی نے اس کے مقابلہ کے لئے فوجیں بھیجیں، صحابہ نے خود بلا کسی کی تحریک کے اپنی طرف سے ایک قاصد بھیجا کہ فوج کے ساتھ جائے اور دم دم کی خبریں بھیجتا رہے، تاکہ اگر ضرورت ہو تو خود ہم لوگ نجاشی کی مدد کو آئیں۔ صحابہ نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ پنج وقتہ نمازوں میں نجاشی کی فتح کی دعائیں مانگتے تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ محدث طبری نے اپنی تاریخ میں پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ کوئی رعایا حکومت کے ساتھ اس سے زیادہ اور کیا وفاداری اور اطاعت شعاری کرسکتی ہے؟ کیا آج گورنمنٹ کو اس سے زیادہ کچھ درکار ہے۔

اسلام کی تاریخ میں اکثر غیر قومیں اسلامی ملکوں پر قابض ہوگئیں، اس وقت ہزاروں فقہاء اور علماء موجود تھے۔ کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کے متعلق فقہی احکام نہ مرتب کرتے، تاتاریوں نے جب تمام ایران اور عراق پر قبضہ کرلیا تو اس وقت جس قدر فقہ کی کتابیں تصنیف ہوئیں سب میں اس کے متعلق تفصیلی احکام موجود ہیں، اصل بحث یہ پیدا ہوئی کہ یہ ممالک دار الاسلام ہوں گے یا دار الحرب، تمام فقہاء نے بہ اتفاق لکھا کہ جب تک اسلامی احکام یعنی نماز، روزہ وغیرہ جاری ہیں، اس وقت تک

(۱) عبدالرحمان بن عوفؓ کا ذکر تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۱۸۸ پر ہے، مطبوعہ بریل [illegible] کی۔

یہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ محض تصوری یعنی زبانی باتیں تھیں۔ کثرت سے تاریخی واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ مسلمانوں کا ہمیشہ طرز عمل یہ رہا۔ وہ جو کچھ کہتے تھے، کرتے بھی تھے۔ ساتویں صدی میں جزیرہ سسلی پر عیسائی حکومت قابض ہو گئی تھی اور راجر تخت نشین حکومت تھا۔ اس وقت تک وہاں کثرت سے مسلمان موجود تھے۔ ان کا طرز عمل یہ تھا کہ بادشاہ کے نہایت مطیع اور وفادار تھے۔ یہاں تک کہ بادشاہ کو جس قدر ان پر اعتماد تھا، خود اپنی عیسائی رعایا پر نہ تھا۔ علامہ ابن جبیر نے اسی زمانہ میں سسلی کا سفر کیا تھا۔ وہ ان واقعات کو لکھ کر لکھتا ہے کہ یہاں پر تمام بڑے بڑے عہدوں پر مسلمان مامور ہیں۔ یہاں تک کہ شاہی باورچی خانہ کا اہتمام بھی مزید اعتماد کی وجہ سے مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں ہے۔

تاتاری جس زمانہ میں ایران اور عراق پر قابض تھے۔ اکثر بڑے بڑے عہدوں پر مسلمان ہی مامور تھے۔ ہلاکو خان کی سفاکی اور اسلام کی دشمنی مسلّم عام ہے۔ بغداد جو مسلمانوں کے جاہ و جلال کا کعبہ تھا اسی کے ہاتھوں برباد ہوا تھا۔ تاہم اس کے حکومت کے دست و بازو خواجہ رشید الدین اور علاء الدین جوینی تھے۔ خواجہ رشید الدین وزیر اعظم تھے اور درحقیقت کاروبار حکومت انہیں کے ہاتھ سے انجام پاتے تھے۔

ہلاکو خان کے بعد جب اس کا بیٹا اباقا آن خان بادشاہ ہوا تو اس کے دور میں بھی ان دونوں بھائیوں کا وہی احترام رہا۔ علامہ شاکر کتبی نے فوات الوفیات میں جہاں علاء الدین جوینی کا تذکرہ کیا۔ لکھتے ہیں:

صاحب الديوان الخراسانی
اخو الصاحب الكبير شمس الدين
كان لهما الحل والعقد فى دولة
ابغا و نالا من الجاه والحشمة
ما يجاوز الوصف

وزارت خراسان کے مالک اور وزیر اعظم شمس الدین کے بھائی تھے اباقا کی سلطنت میں یہ دونوں بھائی سیاہ و سپید کے مالک تھے اور اس قدر دولت و حشمت ان لوگوں نے حاصل کی جو بیان سے باہر ہے۔

روضۃ الصفا میں جہاں خواجہ شمس الدین (وزیر ہلاکو خان) کا تذکرہ کیا

سے لکھا ہے۔

"چون اباقا خان بر سریر سلطنت قرار گرفت، خواجہ مشار الیہ (خواجہ شمس الدین) زیادہ از عصر و منظور شد، قاضی یافت و شغل تعلیم و وزارت بر قرار سابق با وی مفوض گشت و تمکن بہ مرتبہ صاحب دیوان ثابت و آیین مسعود اہتمام مہام مملکت و ترتیب احوال سپاہی و رعیت و اصلاح خلل و تدارک ذلل بہ نوعی ظہور نمود کہ مزید بر آن متصور نبود۔ ملوک و سلاطین و اکابر خراسان و عراق و بغداد و شام و روم و دمن را ملجا و ماوی شد۔"

یہ اعتماد یہ رتبہ ان لوگوں نے اسی وجہ سے حاصل کیا تھا کہ جس وفاداری، دیانت اور لیاقت سے یہ لوگ بادشاہی خدمت بجا لاتے تھے۔ خود ہلاکو خان کے ہم قوم اور عزیز بجا نہیں لا سکتے تھے۔

محقق طوسی جن کی شہرت محتاج بیان نہیں، وہ بھی ہلاکو خان کے معتمد تھے اور اوقاف ممالک کل انہی کے زیر اہتمام تھے۔ فوات الوفیات میں لکھا ہے۔

کان ذا حرمة وافرة و منزلة عالية عند هلاكو وكان يطيعه فيما يشير به عليه والاموال فى تصريفه

ہلاکو کے دربار میں ان کی بڑی عزت اور قدر تھی۔ ہلاکو ان کے مشوروں پر عمل کرتا تھا اور مال ان کے تصرف میں تھا۔

گو ہم پسند نہیں کرتے لیکن محقق طوسی نے ہلاکو خان کی وفاداری میں اسلام تک کو برباد کر دیا۔ یعنی بغداد کا حملہ اور اس کی بربادی صرف محقق طوسی کے اشارہ سے تھی، ورنہ ہلاکو خان اس پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں اس واقعہ کو محقق طوسی کے مفاخر میں شمار کیا ہے۔

واقعات مذکورہ بالا سے تم کو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد زریں سے آخر تک مسلمانوں کا ہمیشہ یہ شعار رہا کہ وہ جس حکومت کے زیر اثر رہتے اس کے وفادار اور اطاعت گزار رہتے یہ صرف ان کا طرز عمل نہ تھا بلکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی، جو قرآن مجید، حدیث، فقہ سب میں کنایۃً اور صراحۃً مذکور ہے۔

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

غیر قوموں کی مشابہت

ہماری قوم میں نئے علوم و فنون اور نئے تمدن اور شائستگی کے نہ پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں کا اب تک خیال ہے کہ ہم کو غیر قوموں کا تشبہ شرعاً ناجائز ہے، یہی وجہ ہے کہ اب تک قوم کے مقدس حضرات یورپین علوم و فنون، یورپین زبان، یورپین تمدن، یورپین طرز معاشرت سے جہاں تک ہو سکتا ہے، اجتناب کرتے ہیں اور بہ ضرورت کوئی بات اختیار کرنی پڑتی ہے تو ان کا دل ان کو ملامت کرتا رہتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی غلطیوں کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ قدیم تعلیم میں تاریخ کا حصہ شامل نہ تھا اور اس وجہ سے اکثر مسلمان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ اور صحابہؓ کے طرز معاشرت کے تفصیلی حالات سے بالکل آشنا نہیں۔ جس شخص نے سلف کی تاریخ سرسری نظر سے بھی پڑھی ہوگی، وہ اس بات سے کیوں کر انکار کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ نے تمدن اور معاشرت کے متعلق غیر قوموں کی بہت سی باتیں پسند فرمائیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ اصلاح رسومات پر ایک مضمون لکھا ہے۔ اس میں ایک موقع پر وہ تحریر فرماتے ہیں کہ "انبیاء اور پیغمبروں کا یہ طریقہ تھا کہ کھانے، پینے، لباس، تعمیرات، آرائش، خرید و فروخت وغیرہ کے متعلق وہ ان کے معمولات پر نظر ڈالتے تھے، جو ان کی قوم میں پہلے سے جاری تھے، اگر وہ معقول ہوتے تھے تو بعینہ خود رہنے دیتے تھے اور جن باتوں میں کسی قسم کی برائی ہوتی تھی، ان کی اصلاح کر دیتے تھے۔" (۱)

(۱) حجۃ اللہ البالغہ باب الاقامۃ الارتفاقات و اصلاح الرسوم ج ۱ ص ۸۲ مطبع خیریہ [illegible]

اس کے بعد شاہ صاحب نے دیت، قسامت، قسامت وغیرہ کی نسبت لکھا ہے کہ یہ قاعدے زمانہ جاہلیت میں جاری تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح رہنے دئے۔ پھر فرماتے ہیں: "وکان قباذ و ابنہ انوشیروان وضعا علیہم الخراج والعشر فجاء الشرع بنحو من ذلک۔" (۱) یعنی قباذ اور اس کے بیٹے نوشیرواں نے لوگوں پر خراج اور عشر مقرر کیا تھا، پھر شریعت بھی قریب قریب اسی کے مطابق آئی۔ شاہ صاحب نے چونکہ شریعت کا نام لیا اس لئے قریب قریب کا لفظ لکھا، لیکن امام ابوجعفر طبری نے جو محدث اور مجتہد دونوں تھے، جہاں نوشیرواں کے قانون خراج و جزیہ کا ذکر کیا ہے اضافہ یہ الفاظ لکھے ہیں:

"اقتدی بہا عمر بن الخطاب" یعنی حضرت عمرؓ نے نوشیرواں کے ان قاعدوں کی اقتدا اور پیروی کی۔ (۲)

یہ مسلم ہے کہ نوشیرواں مذہباً مجوسی اور قوم کے لحاظ سے ایرانی تھا، پھر جب حضرت عمرؓ کو تمدن اور امور ملکی کے متعلق ایک مجوسی اور ایرانی کی اقتدا سے عار نہ تھا تو آج ہم لوگوں کو یورپ کی عمدہ باتوں کے اختیار کرنے میں کیا مضائقہ ہو سکتا ہے؟

یہ بحث کلی طور پر تھی، اب ہم اس کو شکل میں ان باتوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے ہیں جو قرن اول میں دوسری قوموں سے لی گئیں۔ لیکن قبل اس کے ان حدیثوں سے تعرض کرنا ضرور ہے، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوسری قوموں کی مشابہت سے منع فرماتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی پیغمبر یا بانی مذہب کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالتا ہے تو اس کو خواہ مخواہ بعض ایسی علامتیں مقرر کرنی پڑتی ہیں جو اس کے پیرواں اور عام لوگوں میں امتیاز اور شناخت کا ذریعہ ہوں۔ اس قسم کی علامت کو "شعار" کہا جاتا ہے اور اردو میں اس کا ترجمہ "وردی" یا "تمغہ" کیا جا سکتا ہے۔ یہ شعار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱) حجۃ اللہ البالغہ باب ۱۲ سنن الارتفاقات، اصلاح الرسوم ج ۱ ص ۸۰ (۲) تاریخ طبری ج ۲ ص ۹۶۰

نے بعض بعض چیزوں میں اس قسم کا امتیاز قائم کیا تھا اور ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ان باتوں میں غیر مذہب والوں کی مشابہت نہ اختیار کرو۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دوسری قوموں اور دوسرے مذہب والوں کی ہر بات سے اجتناب کیا جائے سخت غلطی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریق عمل اور متعصب علماء کی نافہمی کی ایک عمدہ مثال یہ ہے کہ غزوہ احزاب میں جب قریش نے بڑے سروسامان سے مسلمانوں پر چڑھائی کی تو سلمان فارسیؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ "ایران میں یہ دستور ہے کہ جب دشمن کی تعداد زیادہ ہوتی ہے تو خندق کھود کر پناہ لیتے ہیں" (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے مشورہ کے مطابق خندق تیار کرائی اور عربی زبان میں خندق کا لفظ اول اسی وقت استعمال ہوا "خندق" کا لفظ "کندہ" کا معرب ہے۔ جس کے معنی کھودے گئے کے ہیں، معرب کرنے کا عام قاعدہ ہے کہ اخیر کی ہائے ہوز کو ق سے بدل لیتے ہیں۔ جس طرح پیادہ سے بیدق، خورنگ سے خورنق، اسی طرح منجنیق اور دبابہ جو لڑائی کے آلات ہیں، عرب میں مستعمل نہ تھے، لیکن فارس اور یونان میں اس کا عام رواج تھا، سب سے پہلے طائف کے محاصرہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رومی غلام مسیحی کے اشارہ سے اس کا استعمال کیا، ان واقعات کے مقابلہ میں "جانثاری" فوج کا واقعہ خیال کرو۔

یہ سلطنت ترکی کی ایک مشہور فوج تھی۔ جس نے یورپ اور ایشیا میں بے شمار فتوحات حاصل کی تھیں، سلطان محمود کے زمانہ میں جب یورپ نے فنون جنگ اور فوجی قواعد میں نئے نئے قاعدے ایجاد کئے تو سلطان موصوف نے اپنی فوج کو بھی انہیں اصول کے موافق مرتب کرنا چاہا، لیکن "جانثاری" فوج نے اس بنا پر انکار کیا کہ ہم کافروں کی تقلید نہیں کرتے، یہ انکار در اصل فوج کی طرف سے نہ تھا، بلکہ

(۱) تاریخ طبری ج ۳ ص ۱۴۶۵

در پردہ شیخ الاسلام کی سازش تھی اور وہ چونکہ صاحب مذہب ہونے کے لحاظ سے اس حیلہ کو بآسانی کر سکتے تھے، سلطان محمود سمجھتا تھا کہ نئے اصول کے اختیار کئے بغیر یورپ کی ہمسری نہیں ہو سکتی، ادھر شیخ الاسلام اور فوج کو اپنے تعصب پر اصرار تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے بغاوت کی اور کئی دن تک خونریزی ہوتی رہی، اسی قسم کی غلطی ہے جو آج کل ہمارے علماء اور متعصب مسلمان کر رہے ہیں اور جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عہد نبوت اور خلافت کے حالات سے بہت کم واقف ہیں اور زیادہ سچ یہ ہے کہ بالکل واقف نہیں۔

اب ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتاتے ہیں کہ معاشرت اور تمدن کے متعلق کیا کیا باتیں غیر قوموں کی اختیار کی گئیں اور کب اور کس وقت اختیار کی گئیں، اس حیثیت سے یہ تحریر ایک تاریخی آرٹیکل ہوگا اور ناظرین کو اس سے زیادہ دلچسپی ہوگی۔

لباس کے متعلق یہ تو ظاہر ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص لباس نہیں اختیار کیا تھا، بلکہ بعثت کے وقت جو لباس مستعمل تھا وہی اسلام میں بھی باقی رہا، لیکن زیادہ تفتیش سے ثابت ہوتا ہے کہ مجوسیوں اور عیسائیوں کی بہت سی چیزیں اختیار کر لی گئی تھیں، عرب میں پاجامہ کا مطلق وجود نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ عربی زبان میں اس کے لئے کوئی لفظ نہ تھا، عرب میں جب اس کا استعمال ہوا تو فارسی لفظ شلوار کو معرب کر کے سروال بنا لیا اور یہی لفظ آج تک مستعمل ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اگرچہ قومی خصوصیت قائم رکھنے کے لحاظ سے لوگوں کو عرب کے قدیم لباس یعنی تہمد کا پابند رکھنا چاہا، چنانچہ عتبہ بن فرقد کو فرمان لکھا، اس میں صاف یہ الفاظ تھے کہ پاجامہ پہننا چھوڑ دو۔ لیکن قبول عام پر کس کا زور ہے، پاجامہ کا رواج اس درجہ عمومیت کے ساتھ ہوا کہ تمام عرب میں تہمد کا رواج بھی نہیں رہا، عینی شرح بخاری میں لکھا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پاجامہ پہنا تھا۔ (۱)

---

(۱) عینی جلد ۱۰ ص ۲۰۰ مطبوعہ قسطنطنیہ

برنس ایک قسم کی لمبی ٹوپی تھی، جس کو خاص عیسائی استعمال کرتے تھے۔
صحابہ میں سے بکثروں نے اس کا استعمال کیا اور خود حضرت عمر فاروقؓ اس کو
استعمال کرتے تھے رفتہ رفتہ جب تعصب کی ابتدا ہوئی تو لوگوں کو اس کے استعمال میں
تامل ہوا لیکن بڑے بڑے ائمہ مذہب نے جواز کا فتویٰ دیا۔ عینی شرح بخاری میں ہے
کہ امام مالک سے لوگوں نے پوچھا کہ کیا برنس کا پہننا اس بنا پر مکروہ ہے کہ عیسائیوں
کے لباس کے مشابہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ "نہیں، نہیں (یعنی مدینہ کے)
لوگ عموماً اس کو استعمال کرتے تھے۔" (۱)

لباس کے سوا معاشرت کی اور بہت سی چیزوں میں غیر قوموں کی تقلید کی
گئی، عرب میں پہلے تابوت کا طریقہ نہیں تھا۔ حضرت زینبؓ کا جب انتقال ہوا تو
حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ جنازہ کے اٹھانے میں کافی پردہ پوشی نہیں ہوتی آیا
اس کی کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی؟ اسماء بنت عمیسؓ بھی اس موقع پر تشریف رکھتی
تھیں، انھوں نے کہا کہ میں نے حبش میں دیکھا ہے کہ مردوں کے لئے تابوت بنائے
جاتے ہیں۔" (۲) چنانچہ ان کی رائے کے مطابق تابوت تیار ہوا۔ حضرت عمرؓ نے دیکھا تو
بہت پسند فرمایا اور اس وقت سے یہ طریقہ جاری ہو گیا۔ معاشرت کے متعلق غیر قوموں
کی رسوم و عادات کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ مسلمانوں نے روم و فارس کی
فتوحات کے ساتھ عیسائیوں اور یہودیوں کے یہاں رشتے ناتے شروع کر دئے۔ مدائن کی
فتح کے بعد سینکڑوں صحابہ نے عیسائی عورتوں کے ساتھ شادیاں کر لیں۔ حضرت عمرؓ کو
اطلاع ہوئی تو انھوں نے سپہ سالار کو خط لکھا اور اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔ انھوں نے
جواب میں لکھا کہ آپ کا یہ حکم آپ کی ذاتی رائے ہے یا منصب خلافت سے متعلق
ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب لکھا کہ اس کو منصب خلافت سے کچھ تعلق نہیں، بلکہ
میری ذاتی رائے ہے اور اس بنا پر ہے کہ تم لوگ اپنی قوم کی عورتوں کو چھوڑ کر غیر قوموں

(۱) عمدۃ القاری ج ۱۰ ص ۳۰۰ (۲) طبقات ابن سعد [illegible] ج ۸ ص ۴۹ یہ
روایت حضرت فاطمہؓ کے باب میں بھی ہے۔ ص [illegible]

سکے نہ ہو رہو " چونکہ اس وقت تمام مسلمانوں میں آزادی کا جوہر موجود تھا، لوگوں نے حضرت عمرؓ کی ذاتی رائے کی کچھ پروا نہ کی اور اپنے ارادوں پر قائم رہے، رفتہ رفتہ ہزاروں عیسائی اور یہودی عورتیں مسلمانوں کے نکاح میں آ گئیں، اور قدرت کے قاعدہ کے مطابق ان کا طرز معاشرت اور رہنے سہنے کے طریقے مسلمانوں میں پھیل گئے، اگرچہ اس سے قومی خصوصیتوں کو کچھ نقصان پہنچا، لیکن بڑا فائدہ یہ ہوا کہ رشتہ داری کے ملنے جلنے سے اسلام کے عقیدے ان کے دلوں میں جڑ پکڑتے گئے اور ان میں سے سینکڑوں مسلمان ہو گئیں، بلکہ سچ پوچھو تو غیر قوموں میں اسلام کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا۔

ملکی نظم و نسق اور طریقہ جنگ تو گویا بالکل فارس اور یونان کے انداز پر قائم ہوا، حضرت عمرؓ نے خراج اور جزیہ کے متعلق جو قواعد جاری کئے وہ بالکل نوشیروان کے مرتب کردہ تھے، چنانچہ امام طبری اور ابن الاثیر وغیرہ نے صاف تصریح کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ تک خزانہ اور دفتر کا بالکل وجود نہ تھا۔ فتوحات میں جو روپیہ آتا تھا وہ اسی وقت تقسیم کر دیا جاتا تھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب روپیہ کی افراط ہوئی تو انہوں نے صحابہ کو جمع کر کے رائے لی کہ یہ زر کثیر کیا کیا جائے، بعض صحابہ جو رومیوں کے دفتر اور حساب کتاب کے طریقے دیکھ آئے تھے، انہوں نے کہا کہ ہم نے شام میں رومیوں کے یہاں دیکھا ہے کہ خزانہ اور فوج کا دفتر مرتب رہتا ہے" (۱) آج کل کا زمانہ ہوتا تو ہمارے علماء من تشبہ بقوم کا مسئلہ پیش کرتے، لیکن حضرت عمرؓ نے اسی وقت چند صاحب دل اشخاص کو بلا کر دفتر کی تیاری کا حکم دیا۔

اسی طرح عدالتوں کا انتظام، پولیس کا محکمہ، صوبجات اور اضلاع کی تقسیم، پبلک ورک، ڈاک کا بندوبست، وغیرہ وغیرہ یہ تمام انتظامات خود خلفائے راشدین کے عہد میں قائم ہوئے اور ٹھیک عجم اور یونان کے نمونہ کے موافق قائم ہوئے، زمانہ مابعد میں جب فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا ترجمہ ہوا تو عربی زبان بالکل غیر قوموں کے علوم و

(۱) تاریخ طبری ج [illegible] ص [illegible] و ابن اثیر ج [illegible] ص [illegible]

فنون سے بھر گئی، یہاں تک کہ خود مذہبی علوم بھی ان کے اثر سے نہ بچ سکے۔

یونانی علوم و فنون کی تقلید اور احتیاج کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ آج یونانی طب کو ہم مسلمانی طب سمجھتے ہیں، حدیث کی کتابوں میں اکثر امراض کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاج مذکور ہیں، یہاں تک کہ طب نبوی ایک مستقل مضمون بن گیا ہے، لیکن تمام اسلامی دنیا میں بیماریوں کا جو علاج کیا جاتا ہے وہ ارسطو اور بقراط کے قاعدے کے مطابق کیا جاتا ہے اور طب نبوی کا ذکر تک نہیں آتا۔ ایک طرف تو یہ بے تعصبی اور آزاد خیالی اور ایک طرف تو یہ تعصب اور ضد کہ یورپ کی کسی بات پر عمل نہ کیا جائے، ورنہ غیر مذاہب والوں کی مشابہت لازم آئے گی اور من تشبہ بقوم کا مصداق بننا پڑے گا۔ ع

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

خلافت

من جملہ ان الفاظ کے جو مسلمانوں میں مذہبی حیثیت سے مستعمل ہیں، ایک یہ لفظ بھی ہے، لیکن چونکہ یہ لفظ پالیٹکس سے بھی تعلق رکھتا تھا اور پولیٹکل اغراض نے اکثر اس کے مفہوم اور حقیقت کو بدل کر تعبیر کرنا چاہا، اس لئے بعض اوقات عوام میں اس کے متعلق غلط فہمیاں پھیل گئیں اور کہنا چاہئے کہ اس کے معنی میں ابہام اور اشتباہ آگیا۔ مسلسل دو سال سے زیادہ نہیں گذرے کہ اردو اخبارات میں یہ بحث ایک اتفاقی واقعہ کی وجہ سے چھڑ گئی تھی اور اس نے کسی حد تک طول بھی پکڑ لیا تھا، لیکن پھر بعض اسباب سے رک گئی۔ اس زمانہ میں سرسید مرحوم نے ایک نہایت دلچسپ آرٹیکل لکھا تھا جو علی گڑھ گزٹ میں شائع ہوا تھا میں نے بھی ایک ضمنی موقع پر اپنے سفرنامہ میں اس بحث کی طرف اشارہ کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ مسئلہ نہایت تحقیق کے ساتھ بالکل صاف کر دیا جائے۔ اس مسئلہ پر دو حیثیتوں سے بحث ہو سکتی ہے۔

۱۔ مذہب کے رو سے منصب خلافت کی کیا حقیقت ہے۔؟

۲۔ شروع اسلام سے آج تک یہ لفظ کن معنی میں اور کن لوگوں کے لئے استعمال کیا گیا۔؟

خلافت یا امامت مترادف الفاظ ہیں اور یہ الفاظ احادیث اور عقائد کی کتابوں میں ایک ہی معنی میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ خلافت یا امامت کی جو تعریف عقائد کی کتابوں میں مذکور ہے وہ یہ ہے "مسلمانوں پر ایک عام تصرف کا اختیار، جس کی اطاعت تمام مسلمانوں پر ضروری ہو" شرح مواقف میں خلافت کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے "آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قائم مقامی دین کے قائم رکھنے، قوم کی حفاظت

کرنے میں ۔ شرعی مقاصد میں یہ نقطہ ہیں ۔ دین اور دنیا کی افسری بحیثیت قائم مقامی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۔

اس منصب کے حاصل ہونے کے لئے اسلام کے تمام فرقوں کے نزدیک جو شرطیں ہیں، ان میں سے ایک بڑی مقدم شرط یہ ہے کہ وہ شخص قریش کے خاندان سے ہو۔ اس شرط سے مسلمانوں کے فقط ایک گروہ یعنی معتزلہ نے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ گروہ کئی سو برس سے دنیا سے بالکل معدوم ہو گیا ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ آج تمام دنیا کے مسلمانوں کے مذہبی اعتقاد کے مطابق صرف وہ شخص خلیفہ یا امام ہو سکتا ہے جو قریش کے خاندان سے ہو۔ جس بنا پر خلافت کے لئے یہ شرط ضروری سمجھی گئی ہے، وہ وہ حدیثیں ہیں جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف پیرایوں میں نہایت کثرت سے منقول ہیں، چنانچہ ان کو ہم اس موقع پر تفصیل کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔

۱۔ الائمۃ من قریش	امام قریش میں سے ہوں گے۔ (مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ ص ۱۲۹)
۲۔ الملک من قریش	حکومت قریش میں رہے گی۔ ترمذی (صحیح)
۳۔ الخلافۃ فی قریش	خلافت قریش میں ہوگی۔ (مسند امام احمد بن حنبل، اس کے تمام راوی ثقہ ہیں۔
۴۔ یکون اثنا عشر امیرا ...... کلھم من قریش	بارہ امیر ہوں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے (صحیح بخاری، کتاب الاحکام باب الاستخلاف ج ۲ ص ۱۰۷۲)
۵۔ الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم یکون ملکا	خلافت تیس برس رہے گی، پھر اس کے بعد سلطنت ہو جائے گی۔ (ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی) ابن حبان نے بھی اس کو صحیح لکھا ہے۔ (۱)
۶۔ لا یزال امر الناس ماضیا	لوگوں کا کام اس وقت تک ٹھیک رہے گا

(۱) عینی شرح بخاری ج ۱۱ ص ۴۴

ما و لاھم اثنا عشر رجلا۔۔۔ کلھم من قریش (۱)

جب تک بارہ شخص حکمران رہیں گے جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔

ان احادیث میں سے بعض کا تو صریح مطلب یہ ہے کہ خلافت قریش کا حق ہے، اور بعض میں بطور پیشین گوئی کے خود یہ بیان کیا گیا ہے کہ خلافت ہمیشہ قریش میں رہے گی، لیکن چونکہ یہ پیشین گوئی سو برس ہو چکے کہ تمام دنیا میں کوئی حکمراں قریش کے خاندان سے نہیں ہے اس لئے ان احادیث کا یہ مطلب قرار دیا گیا ہے کہ خلافت کا حق درحقیقت صرف قریش کو ہے اور خاندان کے لوگ جو حکمران ہیں وہ بادشاہ ہیں، مگر خلیفہ نہیں ہیں، لیکن جس حدیث میں مذکور ہے کہ خلافت صرف تیس برس رہے گی، پھر سلطنت ہو جائے گی، اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ تیس برس کے بعد جو فرماں روا ہوئے وہ باوجود قریش ہونے کے خلیفہ نہ تھے، بلکہ بادشاہ تھے۔

بہرحال تمام روایات کا قدر مشترک یہ ہے کہ خلافت کے لئے قریش ہونا ضرور ہے اور جو شخص قریش کے خاندان سے نہ ہو وہ کسی طرح تمام مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق خلیفہ نہیں بن سکتا۔

مسلمانوں نے کبھی اور کسی زمانہ میں اس شخص کو خلیفہ نہیں مانا جو قریش کے خاندان سے نہ ہو، سب سے اول جس موقع پر یہ مسئلہ زیر بحث آیا، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا دن تھا، یعنی آپ کی وفات کے دن انصار نے جن کو لوگ مدینہ کے رہنے والے تھے، یہ دعویٰ کیا کہ خلافت ہمارا حق ہے، لیکن جب مہاجرین نے ان کے مقابلہ میں یہ استدلال پیش کیا کہ خلافت صرف قریش کا حق ہے تو انہوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئے، چنانچہ یہ واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری (ج ۴ ص ۱۸۱۸ و مابعد) ابن اثیر (ج ۲ ص ۲۲۲ و مابعد) ابن خلدون (ج ۲ ص ۲۰۸) میں مذکور ہے، عباسیوں کی سلطنت میں جب ضعف آ گیا تو ہر طرف خود مختار حکومتیں پیدا ہو گئے، ان میں بعض بعض خاندانوں نے وہ

---

(۱) صحیح مسلم کتاب الامارۃ باب الناس تبع لقریش ج ۲ ص [illegible]

جبروت و اقتدار حاصل کیا اور ان کے حدود سلطنت اس قدر وسیع ہو گئے کہ خود دولت عباسیہ کے زمانہ میں کبھی نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ان میں سے کبھی کسی نے خلافت کا دعویٰ نہیں کیا اور ہمیشہ عباسی خلیفہ کے آگے (باوجود اس کے کہ وہ دل کے بیاور شاہ سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتے تھے) سر جھکاتے رہے اور اس کی صرف یہ وجہ تھی کہ وہ خود قریش کے خاندان سے نہ تھے اور اس لئے اگر وہ خلافت کا دعویٰ کرتے تو مسلمانوں میں سے ایک شخص بھی ان کے دعویٰ کو تسلیم نہ کرتا۔

عضد الدولہ، محمود غزنوی، ملک شاہ سلجوقی، دنیا کے بہت بڑے عظیم الشان شاہنشاہ گزرے ہیں۔ لیکن یہ سب کے سب بغداد کے دربار سے لقب اور خطاب حاصل کرتے تھے اور اس پر فخر و ناز کرتے تھے۔ عضد الدولہ جس کو شاہنشاہ کا لقب حاصل تھا اور جو بڑی سطوت و اقتدار کا بادشاہ گزرا ہے۔ ۳۶۹ھ میں جب بغداد میں طائع للہ خلیفہ عباسی کے دربار میں لقب لینے کے لئے حاضر ہوا تو سب سے پہلے اس نے زمین چومی، پھر پیچھے ہٹ کر دوبارہ زمین چومی۔ اس طرح سات دفعہ زمین بوسی کی اور جب خلیفہ نے مہربانی سے اس کو زیادہ تقرب کی اجازت دی تو اس نے بڑھ کر خلیفہ کے پاؤں چومے، اس وقت خلیفہ نے اس کو کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا۔ لیکن اس نے بار بار معذرت کی اور جب خلیفہ نے اس کو مجبور کیا تو الامر فوق الادب کے لحاظ سے کرسی کو بوسہ دے کر اس پر بیٹھ گیا اور کہا کہ "میں خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ حضور کی اطاعت مجھ سے اچھی طرح بن آئے" ان تقریبات کے ادا کرنے کے اثنا میں عضد الدولہ کا ایک افسر جو اس کے ساتھ تھا اس بت پرستی سے گھبرا کر بول اٹھا کہ "کیا یہ خدا ہے؟ کہ آپ اس طرح تعظیم بجالاتے ہیں" عضد الدولہ نے کہا کہ "ہاں یہ خدا کا خلیفہ ہے"۔(۱)

مصر میں جب فاطمیہ خاندان نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی اور خاندان عباسی اس کو دبا نہ سکا تو عباسیوں سے بجز اس کے اور کوئی تدبیر بن نہ آئی کہ ایک محضر لکھوایا، جس میں فاطمیہ کے نسب کا انکار تھا اور اس پر تمام علماء سے دستخط کرائے

(۱) تاریخ الخلفاء ص ۱۹ ، ۴۱۸

اور اس طرح لوگوں کو ان کی طرف سے برگشتہ کیا، جس کا یہ اثر ہوا کہ ایک مدت مدید کے بعد فاطمیہ کے ایک افسر نے خلیفہ فاطمی کو تخت سے اتار دیا اور عباسیہ کی سلطنت قائم کر دی۔ یہ افسر صلاح الدین ایوبی تھا۔ جو آج - فاتح بیت المقدس - کے نام سے تمام عالم میں مشہور ہے۔

۶۵۶ھ میں بغداد کی سلطنت جب ہلاکو کے ہاتھ سے تباہ ہو گئی اور خاندان بنی عباس برباد کر دیا گیا تو اس خاندان میں ایک شخص جس کا نام احمد ابوالقاسم تھا اور جیل خانہ میں مقید تھا۔ بھاگ کر مصر پہنچا۔ یہاں اس وقت ملک ظاہر بیبرس کی حکومت تھی۔ احمد کے پہنچنے کے ساتھ ظاہر نے ایک بہت بڑا دربار کیا اور بڑے عجز و نیاز کے ساتھ احمد کے ہاتھ پر بیعت کی۔ احمد کی وفات کے بعد چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لئے ایک اور عباسی شہزادہ جو بغداد کی تباہی میں بچ گیا تھا۔ خلیفہ کیا گیا اور ایک مدت تک اس کے خاندان میں یہ (برائے نام) خلافت رہی۔ یہ خلفاء اگرچہ اس قدر بے اختیار اور بے حقیقت تھے کہ ان کو بجز مقررہ وظیفہ کے کسی قسم کی حکومت حاصل نہ تھی۔ تاہم مذہبی عظمت یہ تھی کہ بادشاہ وقت ہمیشہ ان کے آگے سر جھکاتا تھا۔ ہندوستان کے مشہور بادشاہ تغلق نے اسی خاندان کی سلطنت کا فرمان منگوایا تھا اور اس پر اس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا کہ تمام شہر کی آئینہ بندی کرائی اور شعراء نے مبارک بادی کے قصیدے لکھے۔ بدر چاچ کے ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

جبرئیل از طاق گردون البشرا گویان رسید کز خلیفہ سوئے سلطان خلعت و فرمان رسید

غرض تیرہ سو برس سے آج تک کسی ایسے خاندان نے کبھی خلافت کا دعویٰ نہیں کیا جو قریش کے خاندان سے نہ رہا ہو۔ ناظرین کو حیرت ہوگی کہ اگر ایسا ہے تو ترکی خاندان کو کیوں خلافت کا دعویٰ ہے۔ حالانکہ یہ عموماً مسلم ہے کہ ترک قریش کے خاندان سے نہیں ہیں۔

یہ واقعہ درحقیقت تعجب انگیز ہے اور واقعہ کا سبب اس سے زیادہ تعجب انگیز ہے۔ ترکوں میں سلطان بایزید ثانی تک جو اسی خاندان کا آٹھواں بادشاہ

حقوق الذمیین

یعنی

اسلام میں غیر مذہب والوں کے حقوق

دنیا کے عجیب سے عجیب واقعات کی اگر ایک فہرست تیار کی جائے تو یہ واقعہ ضرور اس میں درج کرنے کے قابل ہوگا کہ مسلمانوں کے متعلق اگرچہ یورپ کی واقفیت کے ذریعے نہایت وسیع ہوگئے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔ اسلامی آبادیوں کا بہت بڑا حصہ اس کے قبضے میں آگیا ہے۔ سینکڑوں عربی داں تیار پیدا ہوگئے ہیں، عربی تصنیفات کثرت سے یورپین زبانوں میں ترجمہ ہوتی جاتی ہیں، مسلمانوں کے نہایت نایاب تاریخی ذخیرے اصلی زبان میں شائع ہوتے جاتے ہیں۔ اورینٹل کانفرنس نے مشرق اور مغرب کو ڈانڈا ملا دیا ہے۔ تاہم غلط معلومات کا بادل جو آج سے کئی سو برس پہلے یورپ کے افق پر چھایا تھا۔ اب تک نہیں چھٹا۔ بہت سے بہت یہ ہوا کہ وہ کسی قدر ہلکا ہوگیا ہے۔ لیکن فضا میں اب بھی اس قدر تاریکی ہے کہ

اِذَا اَخْرَجَ يَدَهُ لَمْ يَكَدْ يَرَاهَا (نور ۲۴: ۴۰) ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا۔

یہ غلط معلومات اول اول مذہبی راستے سے آئے تھے اور چونکہ یورپ میں مذہب کا زور گھٹ گیا ہے۔ اس لئے مذہبی حیثیت کے لحاظ سے اب انکا اثر بھی چنداں قوی نہیں رہا۔ تاہم جب کبھی پولیٹکل ہوا چلتی ہے تو یہ دبی چنگاریاں اس قدر جلد بھڑک اٹھتی ہیں کہ تمام یورپ میں ایک آگ سی لگ جاتی ہے۔

آرمینیہ کے جھگڑے میں ترکوں پر جو مختلف الزامات لگائے گئے ابھی ان کی تحقیق بھی نہیں شروع ہوئی تھی کہ یورپ کے اہل قلم نے دنیا میں غلغلہ ڈال دیا کہ خود مسلمانوں کے مذہب میں عیسائی رعایا سے ایسا سلوک کرنا جو تم ضروری قرار دیا

گیا ہے اور اس وجہ سے یہ تحقیق کرنا کہ ترکوں نے وہ تمام ظالمانہ کارروائیاں کی ہوں گی۔ گویا اس بات کا یقین کرنا ہے کہ ترک اپنے مذہب کے پابند ہیں اور پورے پابند ہیں۔

اس سلسلہ میں تھوڑے دن ہوئے جنوری ۱۸۹۴ء میں پادری میلکم میکال نے بڑے دعوے کے ساتھ ایک آرٹیکل لکھا۔ جس میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ مذہب اسلام عیسائیوں کے حق میں نہایت سخت ظالمانہ قانون ہے اور اسلامی سلطنتوں میں ہمیشہ اس قانون پر عمل درآمد رہا ہے۔ ملک کے مشنریوں نے اس آرٹیکل کا ترجمہ چھاپ کر شائع کیا اور دیباچہ میں یہ تصریح کی کہ یہ آرٹیکل اس قدر مدلل اور پرزور ہے کہ خود ناقص کا جو مسلمان مضمون نگار جو مذہب اسلام کی حمایت میں مقدمین کا سلسلہ رکھتے تھے اس آرٹیکل کے بعد بالکل بند ہو گیا اور کچھ جواب نہ دے سکا۔

آج کل کے مصنفین اسلام نے یورپ کی بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے اس عظیم الشان مسئلہ پر توجہ نہیں کی۔ کتب خانہ اسکندریہ، عورتوں کے حقوق، جزیہ، یہ سب جزئی مباحث تھیں۔ لیکن ذمیوں کے حقوق کا مسئلہ ایسا معرکۃ الشان اور وسیع ہے کہ اگر اس کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیوں کا سارا طلسم ٹوٹ جائے گا۔ میں یہ مضمون اسی خیال سے لکھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ بھی اسی طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو گا۔ جس طرح اس سے پہلے کتب خانہ اسکندریہ و جزیہ کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو چکی ہے۔

اس رسالہ کا موضوع جس پر بحث کا تمام سلسلہ قائم ہے یہ ہے کہ اسلام میں ذمیوں کے کیا حقوق ہیں؟ یہ جملہ تین لفظوں پر مشتمل ہے۔ اسلام، ذمی، حقوق۔ اسلام سے ہماری مراد قرآن یا وہ احادیث نبوی ہیں جن کی صحت اصول حدیث کی رو سے ثابت ہو چکی ہے۔ ذمی ان لوگوں کو کہتے ہیں جو اسلامی حکومت میں آباد ہوں اور جن کا مذہب اسلام نہ ہو۔ لفظ حقوق کی تفسیر کی ضرورت نہیں۔ موضوع کے جو الفاظ ہیں اگرچہ ان کی تشریح یہی ہے جو ہم نے کی۔ لیکن ہمارا دعویٰ اس سے زیادہ وسیع ہے جو موضوع سے مفہوم ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ

مذہب اسلام نے ذمیوں کے حقوق نہایت فیاضی سے قائم کئے اسی طرح ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ صرف تحریری قانون نہ تھا بلکہ تیرہ سو برس کی وسیع مدت میں من حیث الاغلب طریق عمل بھی اسی کے مطابق رہا۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یعنی آغاز نبوت سے فتح مکہ تک جو ۸ ھ میں واقع ہوئی۔ لڑائیوں کا ایک ایسا متصل سلسلہ قائم رہا جس کی وجہ سے موقع ہی نہیں نصیب ہوا کہ اسلام کو حکومت اور سلطنت کی حیثیت حاصل ہوتی اور رعایا کے ساتھ سلطنت کو جو تعلقات ہونے چاہئیں، اس کے متعلق قانون اور قاعدے منضبط ہوتے۔ قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے اس باب میں جن احکام کا پتہ لگتا ہے، وہ خاص مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ یعنی غیر مذہب والوں سے ان کو واسطہ نہیں۔ اس وقت تک غیر مذہب والوں سے جو تعلقات پیدا ہوئے تھے، وہ اس قدر تھے کہ کسی قوم سے کچھ معاہدہ ہوگیا، کسی سے چند شرائط کے ساتھ صلح ہوگئی۔ مختصر یہ کہ اس وقت تک غیر مذہب والے اسلام کی رعایا نہیں کہلاتے تھے۔ خیبر کی آبادی فتح ہوکر بھی صرف اس قدر ہوا کہ یہودیوں سے بٹائی پر معاملہ ہوگیا اور زمین ان کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی۔ فتح مکہ کے بعد یمن، بحرین، عمان، عدن وغیرہ فتح ہوئے۔ ان اضلاع میں کثرت سے دوسری قومیں یعنی یہود، عیسائی، پارسی آباد تھے۔ چونکہ اس وقت امن و امان قائم ہوچکا تھا اور اسلام کو پوری قوت حاصل ہوچکی تھی۔ اسلام نے صاف صاف ان کو رعایا کے لقب سے پکارا اور خود ان کو بھی لقب سے عار نہیں رہا۔ لیکن ان کے متعلق کسی قسم کے مجموعہ احکام نافذ ہونے کے بجائے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ان پر جزیہ مقرر کیا گیا اور اس کے معاوضہ میں ان کو چند حقوق دئے گئے۔ سب سے پہلے (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقریباً ۹ ھ میں نجران کے عیسائیوں پر جزیہ مقرر ہوا۔ ان کے بعد ایلہ، اذرح، اذرعات وغیرہ وغیرہ پر بھی جزیہ لگایا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تمدن سلطنت کا آغاز تھا اور اس وجہ سے تمدنی میں

(۱) فتوح البلدان ص ۷۰ مطبوعہ [illegible] مصر

مسلمان یا ذمی رعایا کے حقوق کی تفصیل نہیں مل سکتی۔ تاہم اس معاملہ کے متعلق جس قدر سرمایہ مل سکے، اس کو نہایت تلاش سے مہیا کرنا چاہئے۔ کیونکہ گو وہ مختصر اور سادہ ہوں۔ لیکن ان سے حقوق الذمیین کے قانون کے اصول معلوم ہوتے ہیں اور اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے کہ آئندہ مابعد میں ذمیوں کے متعلق جو مفصل قانون بنا، اس کا مایہ خمیر کیا تھا؟

بانی اسلام یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا ان کو تحریر کے ذریعہ سے مفصلہ ذیل حقوق دیئے۔

۱۔ کوئی دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص الفاظ یہ ہیں، یمنعوا۔ (۱)

۲۔ ان کو ان کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائے گا، خاص الفاظ یہ ہیں، لا یفتنوا عن دینھم۔ (۲)

۳۔ جزیہ جو ان سے لیا جائے گا، اس کے لئے محصل کے پاس خود جانا نہیں پڑے گا۔

۴۔ ان کی جان محفوظ رہے گی۔

۵۔ ان کا مال محفوظ رہے گا۔

۶۔ ان کے قافلے اور کاروان [یعنی تجارت] محفوظ رہیں گے۔

۷۔ ان کی زمین محفوظ رہے گی۔

۸۔ تمام چیزیں جو ان کے قبضہ میں تھیں بحال رہیں گی۔

۹۔ پادری، رہبان، گرجوں کے پجاری اپنے عہدوں سے برطرف نہیں کئے جائیں گے۔

۱۰۔ صلیبوں اور مورتوں کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔

۱۱۔ ان سے عشر نہیں لیا جائے گا۔

(۱) فتوح البلدان ص ۷۹ (۲) ایضاً ص ۷۱

۲۔ ان کے ملک میں فوج نہ بھیجی جائے گی۔

۳۔ پہلے سے ان کا جو کچھ مذہب اور عقیدہ تھا وہ بدلا یا نہیں جائے گا۔

۴۔ ان کا کوئی حق جو ان کو پہلے سے حاصل تھا زائل نہیں ہوگا۔

۵۔ جو لوگ اس وقت حاضر نہیں ہیں یہ احکام ان کو بھی شامل رہیں گے۔

پہلی اور دوسری دفعہ کے سوا باقی تمام حقوق جس معاہدے سے قائم ہوئے ہیں وہ ذیل میں بعینہٖ منقول ہیں۔

ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبي رسول الله على أنفسهم وملتهم وأرضهم وأموالهم وغائبهم وشاهدهم وعيرهم وبيعهم وأمثلتهم لا يغير ما كانوا عليه ولا يغير حق من حقوقهم وأمثلتهم لا يفتن أسقف من أسقفيته ولا راهب من رهبانيته ولا واقه من وقاهيته على ما تحت أيديهم من قليل أو كثير وليس عليهم رهق ولا دم جاهلية ولا يحشرون ولا يعشرون ولا يطأ أرضهم جيش (۱) الخ۔

ذمیوں کے متعلق اسلام کا جو اصلی قانون ہے وہ اس سے زیادہ نہیں، کیونکہ اسلام صرف ان مسائل اور احکام کا نام ہے جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ سے ثابت ہیں۔ ان کے سوا جو کچھ ہے گو اس نے قوم میں اور ملک میں کوئی اعتبار حاصل کر لیا ہو، لیکن وہ اسلام کا اصلی قانون نہیں ہے۔

ذمیوں کے حقوق کے متعلق اگرچہ یہ مختصر قواعد ہیں اور اسلام کو ابتدائی زمانے میں غیر قوموں کے ساتھ جس قدر کہ تعلق پیدا ہوا تھا، اس کے لحاظ سے اس سے زیادہ ضرورت بھی نہ تھی، تاہم انہیں قواعد میں نہایت مہتم بالشان امور کا ماخذ موجود ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ذمیوں کے حقوق کے متعلق گو کتنا ہی مفصل مجموعہ قوانین بنایا جاوے۔ لیکن اس کی جزئیات ان اصول سے باہر نہیں جا سکتیں۔

(۱) فتوح البلدان ص ۶۵۔ قاضی ابو یوسف نے بھی اس معاہدہ کو کتاب الخراج میں نقل کیا ہے، ص ۴۱ مطبوعہ مصر [illegible]

اب ہم نہایت تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ زمانہ ما بعد میں جب غیر قوموں سے نہایت وسیع اور قوی تعلقات قائم ہوگئے، ذمیوں کے ساتھ اسلامی حکومتوں کا طرز عمل کیا رہا؟ سب سے زیادہ جس زمانے کے واقعات اس بحث کے تصفیہ کے لئے کام آسکتے ہیں، وہ خلافت فاروقی کے واقعات ہیں، ان کی خلافت کا زمانہ ایک معتد زمانہ ہے، اول اول انہیں کے وقت میں غیر قوموں کے ساتھ سلطنت و رعیت کے تعلقات قائم ہوئے، ان کی نسبت مخالفوں نے کہا ہے کہ وہ غیر مذہب والوں کے ساتھ سختی سے برتاؤ کرتے تھے، ان کے عہد میں رعایا کے جس قدر حقوق قائم ہو سکتے ہیں، ہو چکے ہیں اور ہر ایک حق کی نسبت صاف صاف فیصلہ کر دیا گیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی حکومت اسلامی حکومت کی اصلی تصویر خیال کی جاتی ہے۔

حقوق میں سب سے مقدم قصاص کا حق ہے، یعنی یہ کہ قتل و خون کے معاملے میں قاتل اور مقتول کے حقوق برابر سمجھے جائیں، آج جن ملکوں میں تمدن اور تہذیب کی حکومت ہے، ان کا یہ دعویٰ ہے کہ انہوں نے اس مساوات کو قائم رکھا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ الفاظ کے ذریعہ سے یا عمل کے ذریعہ سے؟ میں اس کا فیصلہ ان لوگوں پر چھوڑتا ہوں جو رات دن اپنی آنکھوں سے اس کی مثالیں دیکھتے رہتے ہیں، اس کے مقابلہ میں دیکھو اسلام نے کیا کیا۔

قبیلۂ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو مار ڈالا تھا، حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی، انہوں نے لکھ بھیجا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے حوالہ کر دیا جائے، چنانچہ قاتل حنینی نام ایک شخص کو جو مقتول کے وارثوں میں تھا سپرد کر دیا گیا اور اس نے اس کو قتل کر دیا (۱) جہاں تک ہم کو معلوم ہے، حضرت عمرؓ کے اس طریق عمل سے کسی زمانہ میں اختلاف نہیں کیا گیا، بلکہ حضرت علیؓ نے صاف صاف لفظوں میں فرمایا کہ من کان له ذمتنا فدمه کدمنا و دیته کدیتنا یعنی، جو لوگ ذمی ہو چکے ان کا خون ہمارا خون ہے اور ان کا خون بہا ہمارا

(۱) زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعہ دہلی ص ۳۳۸ و ۳۳۹

خون بہا ہے۔ حضرت علیؓ کو یہ موقع خود بھی پیش آیا اور انھوں نے صاف حکم دے
دیا کہ قاتل جو مسلمان تھا قتل کردیا جائے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جب مقتول کے
وارثوں نے آکر عرض کیا کہ ہم نے خون معاف کردیا تو آپ نے فرمایا کہ تم پر کچھ دباؤ
تو نہیں ڈالا گیا۔ (۱)

عمرؒ بن عبد العزیز جن کو دوسرا عمرؓ کہا جاتا ہے، ان کے عہد میں بھی اس
قسم کا واقعہ پیش آیا اور انھوں نے بھی یہی حکم دیا کہ قاتل مقتول کے وارثوں کے
حوالہ کردیا جائے۔ چنانچہ وارثوں نے اس کو بے تکلف قتل کردیا۔ (۲)

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ولید بن عقبہ جو صحابی تھے کوفہ کے گورنر تھے۔
ایک دفعہ ایک یہودی نے ان کے سامنے شعبدہ بازی کے تماشے دکھائے۔ اس وقت
اور بہت سے تماشائی موجود تھے، ان میں جندب بن کعب ازدی بھی تھے۔ جو بڑے
مشہور تابعی ہیں اور صحیح ترمذی میں ان کی روایتیں منقول ہیں۔ وہ ان شعبدوں کو شیطان
کا اثر سمجھے اور یہودی کو قتل کردیا۔ ولید نے اسی وقت ان کو گرفتار کرلیا اور یہودی کے
قصاص میں قتل کردینا چاہا، لیکن چونکہ وہ بڑے جتھے کے آدمی تھے، ان کے قبیلہ والے
ان کی حمایت کو کھڑے ہوگئے۔ ولید نے اس وقت دفع الوقتی کے لئے ان کو قید خانہ
بھیج دیا اور ارادہ کیا کہ موقع پاکر قتل کردیں گے۔ داروغہ جیل کو ان پر رحم آیا اور کہا
کہ تم چپکے سے بھاگ جاؤ۔ انھوں نے کہا کیوں؟ کیا درحقیقت میں قتل کردیا جاؤں
گا؟ داروغہ جیل نے کہا خدا کی خوشنودی کے لئے تمہارا قتل کردینا کچھ بڑی بات
نہیں۔ غرض وہ بھاگ گئے۔ صبح کو ولید نے جندب کو قصاص کے لئے طلب کیا۔
داروغہ نے کہا کہ وہ تو چھپ کر بھاگ گیا۔ ولید نے اس کے بدلے داروغہ کی گردن مار
دی (۳) ہم کو اس امر سے بحث نہیں کہ داروغہ جیل کا قتل کردینا جائز تھا یا نہیں۔
بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ باوجودیکہ جندب بڑے رتبہ کے آدمی تھے اور یہودی ایک

(۱) زیلعی ص ۲۸ (۲) ایضاً (۳) مسعودی ذکر خلافت عثمانؓ ج ۲ ص ۴۴۹ و ۴۵۰ اور
کتاب الاوائل میں اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

معمولی بازیگر تھا، تاہم ولید کو ایک حکم شرعی کی تعمیل کے لحاظ سے جندب کے قتل کر دینے میں کچھ تامل نہ ہوا۔

اسی سلسلہ میں حضرت عمرؓ فاروق کی شہادت کا واقعہ بھی سننے کے قابل ہے۔ حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام فیروز تھا، جو مجوسی النسل تھا اور عیسائی مذہب رکھتا تھا، حضرت عمرؓ کے بڑے بیٹے عبید اللہ نے گمان کیا کہ اور لوگ بھی اس سازش میں شریک تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبدالرحمنؓ نے چشم دید واقعہ بیان کیا ہے۔ عبید اللہ تلوار ہاتھ میں لے کر نکلے اور فیروز کے بیٹے اور جفینہ و ہرمزان کو جن پر سازش کا شبہ تھا قتل کر دیا، ان میں سے ہرمزان مسلمان ہو گیا تھا، باقی عیسائی تھے۔ عبید اللہ اسی وقت گرفتار کر لیے گئے اور حضرت عثمانؓ جب مسند خلافت پر بیٹھے تو پہلا مسئلہ یہی پیش کیا گیا کہ عبید اللہ کی نسبت کیا کرنا چاہیے، حضرت عثمانؓ نے صحابہ کو بلا کر رائے طلب کی، تمام مہاجرین یعنی ان بزرگوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وطن چھوڑ کر آئے تھے اور تمام صحابہ کی نسبت افضل سمجھے جاتے تھے، یک زبان ہو کر کہا کہ عبید اللہ کو قتل کر دینا چاہیے (۱) حضرت علیؓ بھی اس مجمع میں موجود تھے اور انہوں نے بھی یہی رائے دی۔ اگرچہ حضرت عثمانؓ بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس فیصلہ کی تعمیل نہ کر سکے اور [جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے] حضرت عثمانؓ کی خلافت کی یہ پہلی کمزوری تھی۔ تاہم انہوں نے تینوں مقتولوں کے بدلے بیت المال سے خون بہا دلایا۔ شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ لوگوں نے عبید اللہ کا قتل کیے جانا جو تجویز کیا تھا وہ ہرمزان کے قصاص میں تھا اور ہرمزان مسلمان ہو چکا تھا، لیکن یہ قیاس صحیح نہیں، اولاً تو روایتوں میں اس قسم کی تخصیص کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ نے تینوں کا جو خون بہا دلایا اس میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی۔

ہم کو جہاں تک معلوم ہے اسلام کی تاریخ میں اس خلاف کوئی مثال نہیں

(۱) مسعودی ذکر خلافت عثمانؓ میں اور ابو ہلال کتاب الاوائل میں بھی اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ہے۔ بعض مسلمان مورخوں نے لکھا ہے کہ ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک مسلمان نے کسی ذمی کو مار ڈالا۔ قصاص میں مسلمان ماخوذ ہوا۔ لیکن کسی قسم کی وجہ سے ہارون الرشید کو اس کی رعایت منظور تھی اور اس لئے اس نے چاہا کہ وہ قتل سے بچ جائے۔ چنانچہ قاضی ابو یوسف صاحب کو بلا کر اس کی تدبیر پوچھی۔ قاضی صاحب نے فرمایا کہ شہادت سے یہ ثابت نہیں کہ وہ مارے جانے کے وقت بھی قانوناً ذمی تھا۔ اگرچہ ہمارے نزدیک یہ واقعہ ثابت نہیں تاہم اگر اس کو مان لیا جائے تب بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذمی کے قصاص میں مسلمان کو قتل سے بچانا ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جس کے حیلہ پیدا کرنے کے لئے قاضی ابو یوسف جیسے شخص کی ضرورت پڑی اور وہ بھی اس کے سوا کچھ حیلہ نہ بتا سکے کہ اس کا ذمی ہونا مشتبہ ٹھہرائیں۔

مال اور جائداد کے حقوق جن کو انگریزی میں "رائٹ آف پراپرٹی" اور "رائٹ آف لینڈ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان میں بھی مسلمان اور ذمی برابر درجہ رکھتے ہیں۔ ذمیوں کے قبضہ میں جس قدر زمینیں تھیں اسلام کے بعد بھی بحال رکھی گئیں۔ یہاں تک کہ اگر خلیفہ وقت یا بادشاہ کو مسجد یا کسی اور عمارت کی غرض سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو معاوضہ دے کر لی جاتی۔

حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دجلہ کی نہر سے گھوڑوں کے پالنے کے لئے ایک رمنہ بنانا چاہا۔ آپ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو جو بصرہ کے گورنر تھے، لکھ بھیجا کہ اگر وہ زمین ذمیوں کی نہ ہو اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنوؤں کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دے دی جائے (۱) خلیفہ منصور عباسی نے جب بغداد کو دارالخلافہ بنانا چاہا تو آس پاس کی قوموں جو وہاں کی زمین دار تھیں ان سے قیمت دے کر مول لی (۲) حیرہ میں قدیم زمانہ کے محل اور ایوان تھے جو اسلام کے زمانہ میں ویران ہو چکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں کوفہ میں جو جامع مسجد بنی، اس میں کچھ ملبہ وہاں کے مکانات سے آیا تھا اگرچہ ان کا کوئی قانونی وارث نہ تھا تاہم چونکہ ذمیوں کی زمین میں تھا اس

(۱) فتوح البلدان ص ۲۹۰ (۲) ایضاً ص ۲۹۵

بڑے ذمیوں کو ان کی قیمت ان کے جزیہ میں مجرا دی گئی (۱) اس کے سوا سیکڑوں واقعات ہیں جن سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ ذمیوں کے مال اور جائداد سے کبھی تعرض نہیں کیا گیا۔

آغاز اسلام ہی میں یہ مسئلہ بڑے معرکہ کے ساتھ طے ہوگیا تھا کہ غیر مذہب والے جو اسلام کی رعایا بن گئے ہیں، ان کی مقبوضہ زمینیں ان کے قبضہ سے نکالی نہیں جا سکتیں، حضرت عمرؓ کے عہد میں جب عراق فتح ہوا تو عبدالرحمان بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ جس قدر مفتوحہ زمین ہے اہل فوج کو تقسیم کر دی جائے۔ حضرت عمرؓ نے انکار کیا اور دیر تک بحث رہی، آخر یہ ٹھہرا کہ تمام مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا جائے، چنانچہ ایک بڑا مجمع ہوا اور انصار میں سے دس شخص جو اپنے اپنے قبیلہ کے وکیل اور قائم مقام تھے مجمع میں حاضر ہوئے۔ تمام بڑے بڑے مہاجرین و صحابہ یعنی حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، طلحہؓ، عبداللہ بن عمرؓ وغیرہ بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر نہایت توضیح سے اس مسئلہ کو بیان کیا، بلالؓ اور عبدالرحمان بن عوفؓ اب بھی مخالف رہے۔ لیکن عام رائے یہ ہوئی کہ ذمی اپنی زمینوں سے بے دخل نہیں کئے جا سکتے۔ حضرت بلالؓ اس پر بھی قائل نہیں ہوتے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے جب قرآن مجید کی ایک آیت استدلال میں پیش کی تو ان کو مجبور ہونا پڑا اور بلا اختلاف تمام صحابہؓ کے اتفاق سے یہ مسئلہ طے ہوگیا۔ (۲)

اسی بنا پر فقہ کا یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ اگر بادشاہ یا امام وقت کسی ذمی کی زمین کو ذمیوں کے قبضہ سے نکالنا چاہے تو نہیں نکال سکتا۔ قاضی ابو یوسفؒ کتاب الخراج میں لکھتے ہیں :

ولیس له ان یاخذها بعد ذلک منهم وهی ملک لهم یتوارثونها ویتبایعونها

یعنی امام وقت کو یہ اختیار نہیں کہ اس کے بعد ان سے زمین کو چھین لے اور وہ زمین ان کی ملک ہے، ان میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے گی اور

(۱) فتوح البلدان ص ۲۶۶ (۲) یہ پوری تفصیل کتاب الخراج ص ۱۴، ۱۵ میں ہے۔

وہ اس کو خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں جاگیرات کا ایک صیغہ قائم کیا تھا۔ یعنی حقوق اسلامی کے لحاظ سے جس کو مناسب سمجھتے تھے اس کو جاگیر عطا کرتے تھے۔ لیکن چونکہ یہ جاگیرات بالکل ذمیوں کی مملوکہ تھیں اور حضرت عمرؓ کو ان میں کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہ تھا، اس لئے اس غرض کے لئے خاص وہ زمینیں مخصوص کی تھیں جو کسی کی ملک نہ تھیں، چنانچہ اس قسم کی زمینیں حسب ذیل تھیں، جاگیرات خالصہ جو نوشیرواں نے خاندان شاہی کے لئے مخصوص کی تھیں، لاوارث اشخاص کی زمین، دریا برآمد، ڈاک خانہ کے متعلق زمین۔

اس کے ساتھ یہ اصول بھی قرار پایا کہ جو ملک بزور فتح کیا جائے، وہاں کے باشندوں کی جائداد فروخت کرنے پر بھی مسلمانوں کے ہاتھ منتقل نہیں ہو سکتی۔ یہ قاعدہ اگرچہ اس غرض سے مقرر ہوا تھا کہ مسلمان کے قبضہ میں آجانے سے زمین دہ عشری ہو جاتی ہے اور خراج کو نقصان پہنچتا ہے۔ تاہم اس قاعدے نے ذمیوں کو بہت بڑا فائدہ یہ پہنچایا کہ زمین کسی حالت میں ان کے خاندان اور ان کی قوم کے قبضہ سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ چنانچہ اس کے خلاف اگر کبھی عمل ہوا تو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا گیا، امام لیث بن سعد نے مصر میں تھوڑی سی زمین مول لی تھی، اس پر وہاں کے بڑے بڑے محدث مثلاً ابن لہیعہ اور نافع بن یزید معترض ہوئے (۱) عقبہ بن عامر ایک بڑے بزرگ صحابی تھے اور امیر معاویہؓ نے ان کو مصر کا گورنر مقرر کیا تھا، وہ مصر کے ایک گاؤں میں اپنی سکونت کے لئے مکان بنوانا چاہتے تھے، چنانچہ امیر معاویہؓ نے اس غرض سے ان کو ایک ہزار جریب زمین عطا کی، انہوں نے خراب اور افتادہ زمین جو کسی کے قبضہ میں نہ تھی منتخب کی اور جب ان کے نوکر نے کہا کہ کوئی عمدہ قطعہ لیجئے تو انہوں نے کہا یہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ معاہدہ میں جو شرطیں ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ ذمیوں کی زمین ان کے قبضہ سے نکالی نہیں جائے گی (۲) ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اکثر

---

(۱) مقریزی ص ۲۹۵ (۲) ایضاً ص ۲۰۸

ممالک میں جو خراج ذمیوں پر مقرر کیا گیا۔ اس کے ساتھ یہ شرط بھی لکھ دی گئی کہ آیندہ کبھی اس پر اضافہ نہ کیا جائے گا، خود مصر کے معاہدہ میں یہ شرط داخل تھی، چنانچہ امیر معاویہؓ نے جب مصر کے عامل وردان کو لکھا کہ خراج کی مقدار میں اضافہ کیا جائے تو اس نے صاف انکار کیا اور جواب میں لکھا کہ معاہدہ میں شرط ہو چکی ہے کہ خراج مقررہ پر اضافہ نہ ہوگا۔ اگرچہ اس میں شبہ نہیں ہو سکتا کہ زمانہ مابعد میں خراج کی مقدار بدلتی رہی، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ اصل جمع پر اضافہ ہوا، بہت سی زمینیں نئی آباد ہو گئی تھیں اور ان پر اضافہ ہونا خود مقتضائے انصاف تھا۔

سب سے مقدم اور ضروری بحث مذہبی حقوق کی ہے، یورپ میں جس گروہ نے اسلام کو نکتہ چینیوں کا ہدف بنا رکھا ہے، ان کی حوصلہ آزمائی کا بڑا جولان گاہ یہی ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی بالکل نہیں ہے اور قدیم اسلامی حکومتوں نے غیر قوموں کے مذہبی حقوق بالکل پامال کر دئے تھے، لیکن ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے تمام دنیا کی قوموں کو جس حد تک مذہبی آزادی دی کبھی کسی قوم نے نہیں دی، نہ اب دینے کا دعویٰ کر سکتی ہے، یورپ دو سو برس پہلے تو مذہبی آزادی کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا۔ آج بے شبہ اس کو یہ دعویٰ ہے۔ مگر کیوں ہے؟ اس لئے کہ اس کو خود مذہب کی پروا نہیں رہی، بے شبہ یورپ گرجا اور مسجد کے جھگڑے میں انصاف کا پلہ برابر رکھتا ہے، لیکن اگر ایک سڑک اور مسجد کا معاملہ پیش آجائے تو مسجد بے تکلف برباد کر دی جاتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس فیاضی پر ناز ہے وہ مذہبی آزادی کا نہیں بلکہ مذہبی بے پروائی کا اثر ہے۔

مذہبی آزادی کے متعلق اسلام کا جو اصول ہے۔ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجرانیوں کے معاہدہ میں تحریر فرمائے تھے اور جس کو ہم اس مضمون کے پہلے حصہ میں نقل کر چکے ہیں، یعنی یہ کہ پادری وغیرہ اپنے منصب پر بحال رہیں گے اور مذہب سے کچھ تعرض نہ کیا جائے گا، یہ خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام ہیں اور اس لئے دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا

ہے کہ یہ خاص اسلام کے احکام ہیں۔ اس سے یہ بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ خلفائے راشدین جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کے یادگار تھے، اس باب میں ان کا طرز عمل کیا رہا ہوگا؟ لیکن ہم صرف قیاس پر قناعت نہیں کرتے، تاریخ کی مستند کتابیں، مثلاً بلاذری، طبری، ازدی وغیرہ میں سیکڑوں معاہدے اصلی الفاظ میں مذکور ہیں، جن کا قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کے مذہب سے تعرض نہ کیا جائے گا۔ چنانچہ مزید اطمینان کے لئے ہم بعض معاہدوں کو اس مقام پر نقل کرتے ہیں، خالد نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جب حیرہ پر فتح حاصل کی تو یہ معاہدہ لکھ دیا۔

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ ولا یمنعون من ضرب النواقیس ولا من اخراج الصلبان فی یوم عیدھم (۱)

یعنی ان کے گرجے برباد نہ کئے جائیں گے۔ نہ ان کو ناقوس بجانے سے منع کیا جائے گا، نہ عید کے دن صلیب کے نکالنے سے روکا جائے گا۔

عانات پر جب خالدؓ کا گذر ہوا تو وہاں کا پادری ان کے پاس حاضر ہوا اور انھوں نے ان شرائط پر اس سے صلح کرلی۔

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ وعلی ان یضربوا نواقیسھم فی ای ساعۃ شاؤا من لیل او نھار الا فی اوقات الصلوۃ وعلی ان یخرجوا الصلبان فی ایام عیدھم (۲)

یعنی ان کے گرجے برباد نہ کئے جائیں گے، وہ نماز کے وقتوں کے سوا رات دن میں جس وقت چاہیں ناقوس بجائیں اور تمام تہواروں میں صلیب نکالیں۔

قاضی ابو یوسف صاحبؒ نے کتاب الخراج میں ان احکام کو نقل کر کے لکھا ہے کہ خالدؓ کے ان معاہدوں پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ اس لحاظ سے اگرچہ اصطلاح کے موافق

---

(۱) کتاب الخراج ص ۸۰ (۲) ایضاً ص ۸۱

کہا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اس مسئلہ پر صحابہؓ کا اجماع ہو گیا تھا اور یہی وجہ ہے کہ زمانہ مابعد میں جب کبھی کسی متعصب فرماں روا نے اس کے خلاف کرنا چاہا تو مذہبی پیشواؤں نے فوراً مخالفت کی اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے یہ جرأت نہ کر سکے تو اس کے مرنے کے بعد اس کی تلافی کرا دی گئی۔ ہارون الرشید جب نائس فورس قیصر روم کی بار بار بغاوت سے نہایت برہم ہوا تو عیسائیوں کی طرف سے اس کے خیالات بہت کچھ بدل گئے تھے۔ غالباً اسی کا اثر تھا کہ اس نے قاضی ابو یوسف صاحبؒ سے جو مذہبی صیغہ کے افسر کل تھے، پوچھا کہ عیسائیوں کے گرجے اسلام میں کیوں محفوظ رہے اور آج ان کو کیوں یہ اجازت حاصل ہے کہ وہ علانیہ صلیب نکالتے ہیں؟ اس کا جواب جو قاضی صاحبؒ نے لکھا اس کے خاص الفاظ یہ ہیں۔

انما كان الصلح جرى بين المسلمين و اهل الذمة فى اداء الجزية و فتحت المدن على ان لا تهدم بيعهم و لا كنايسهم داخل المدينة و لا خارجها و على ان يقاتلوا من ناواهم عن عدوهم و على ان يخرجوا الصلبان فى اعيادهم فافتتحت الشام كلها و الحيرة الا اقلها على هذا، فلذالك تركت البيع و الكنائس و لم تهدم (۱)۔

یعنی مسلمانوں اور ذمیوں سے جزیہ کی بنا پر جو صلح ہوئی تھی، اس شرط پر ہوئی تھی کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے شہر کے اندر ہوں یا باہر، برباد نہ کئے جائیں گے اور یہ کہ ان کا کوئی دشمن ان پر چڑھ آئے تو ان کی طرف سے مقابلہ کیا جائے گا اور یہ کہ وہ تیوہاروں میں صلیب نکالنے کے مجاز ہیں۔ چنانچہ تمام شام اور حیرہ (باستثناء بعض مواضع کے) انہیں شرائط پر فتح ہوا اور یہی وجہ ہے کہ خانقاہیں اور گرجے اسی طرح چھوڑ دیئے گئے اور برباد نہیں کئے گئے۔

خلیفہ ہادی کے زمانہ میں ۱۶۹ھ میں جب علی بن سلیمان مصر کا گورنر مقرر ہوا تو حضرت مریمؑ کے گرجا اور چند گرجوں کو منہدم کرا دیا، ہادی نے ایک سال کی مہلت

(۱) کتاب الخراج ص ۸۰

کے بعد وفات پائی اور ہارون الرشید تخت نشین ہوا۔ اس نے علی کو معزول کر کے ۱۷۱ھ میں موسیٰ بن عیسیٰ کو مصر کا گورنر مقرر کیا۔ موسیٰ نے گرجوں کے معاملہ میں علماء سے استفتا کیا۔ اس وقت مصر کے تمام علماء کے پیشوا لیث بن سعد تھے۔ جو بہت بڑے محدث اور نہایت مقدس اور بزرگ تھے۔ انھوں نے علانیہ فتویٰ دیا کہ منہدم شدہ گرجے نئے سرے سے تعمیر کرا دیئے جائیں اور دلیل یہ پیش کی کہ مصر میں جس قدر گرجے ہیں خود صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں تعمیر ہوئے تھے۔ چنانچہ تمام گرجے سرکاری خزانہ سے تعمیر کرا دیئے گئے (۱) علامہ مقریزی نے تاریخ مصر میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں لکھا ہے:

فبنيت كلها بمشورة الليث بن سعد و عبد الله بن لهيعة و قالا هو من عمارة البلاد واحتجا بان الكنائس التي بمصر لم تبن الا في الاسلام في زمن الصحابة والتابعين (۲)

اسی طرح دمشق کا ایک گرجا ایک رئیس کی بے جا فیاضی سے خاندان بنی نصر کے قبضہ میں آ گیا تھا۔ حضرت عمرؒ بن عبد العزیزؒ نے اپنے عہد خلافت میں اس کو بنی نصر سے چھین کر عیسائیوں کے حوالہ کر دیا۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اس موقع پر ہم ایک ایسا واقعہ نقل کرتے ہیں، جو صرف ایک جزئی واقعہ کی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ اس سے جانشینان اسلام کے عام طرز عمل کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دمشق کی جامع مسجد ایک گرجا کے متصل تھی، جس کا نام یوحنا گرجا تھا۔ امیر معاویہؓ نے اپنے عہد خلافت میں ضرورت کی وجہ سے چاہا کہ گرجا کو مسجد میں شامل کر لیں۔ لیکن عیسائیوں نے انکار کیا۔ امیر معاویہؓ مجبور رہے۔ عبد الملک بن مروان نے اپنے زمانہ میں عیسائیوں سے درخواست کی اور معاوضہ پیش کیا۔ عیسائی پھر راضی نہ ہوئے اور عبد الملک کو باز رہنا پڑا۔ ولید نے اپنے زمانہ خلافت میں عیسائیوں کے آگے ایک بہت بڑی رقم پیش کی، وہ اسی طرح انکار کرتے رہے، ولید نے غصہ میں آ کر کہا

(۱) النجوم الزاہرہ واقعات ۱۷۱ھ (۲) مقریزی ج ۲ ص ۵۱۱

کہ تم خوشی سے نہیں دیتے تو ہم جبراً لے لیں گے۔ عیسائیوں نے کہا کہ جو شخص کسی گرجا کو نقصان پہنچاتا ہے، وہ پاگل یا کوڑھی ہوجاتا ہے۔ ولید کو اس پر زیادہ غصہ آیا خود اپنے ہاتھ میں کدال لے کر گرجا کی دیوار ڈھانی شروع کی اور بالآخر گرجا مسجد میں شامل کرلیا گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں عیسائیوں نے اس تعدی کی شکایت کی، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے دمشق کے عامل کو لکھ بھیجا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد میں ملایا گیا ہے، وہ عیسائیوں کو واپس کردیا جائے۔ اس پر مسلمانوں کو نہایت رنج ہوا کہ ہم جس مسجد میں نماز پڑھ چکے اور اذانیں دے چکے، اس کو کیوں کر ڈھائیں۔ آخر عیسائیوں کے پاس جاکر خوشامد کی اور کہا کہ، آغاز فتح میں غوطہ دمشق کے جس قدر گرجے مسلمانوں کے قبضہ میں رہ گئے تھے اور اب تک ہیں، وہ سب واپس کردیئے جائیں گے، اگر تم اس مسجد کو ڈھا دینے سے باز آؤ۔ عیسائی اس پر راضی ہوئے اور عمر بن عبدالعزیز کو اس کی اطلاع دی گئی، انھوں نے عیسائیوں کی خواہش کے موافق مسجد کا منہدم کرنا روک دیا اور ان کو غوطہ دمشق کے تمام گرجے دلا دیئے۔ (۱)

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غیر مذہب والوں کی کسی عبادت گاہ پر تصرف کرنا کس قدر پرخطر کام کیا جاتا تھا اور مقدس خلفاء کہاں تک گرجاؤں وغیرہ کا لحاظ رکھتے تھے۔

یورپین مصنفوں کی طرف سے بڑا اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں نئے گرجاؤں یا بت خانوں کے بننے کی اجازت نہ تھی۔ لیکن یہ ان کی سرسری معلومات کا نتیجہ ہے، یہ بحث خود صحابہؓ کے زمانہ میں پیش آچکی تھی اور اس کا فیصلہ کردیا گیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا تو انھوں نے جواب دیا کہ جو شہر مسلمانوں کے خاص آباد کردہ ہیں، وہاں غیر مذہب والوں کو یہ حق حاصل نہیں کہ گرجا اور بت خانہ بنائیں، یا ناقوس بجائیں، باقی جو قدیم شہر ہیں وہاں ذمیوں سے جو معاہدہ ہے مسلمانوں کو اس کا پورا کرنا ضرور ہوگا (۲) حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا

(۱) یہ پوری تفصیل فتوح البلدان ص ۱۲۵ میں مذکور ہے۔ (۲) کتاب الخراج ص ۸۰

یہ فتویٰ بھی اس لحاظ سے تھا کہ اس وقت تک مسلمان اور دوسری قومیں اچھی طرح ملے جلے نہیں تھے ۔ لیکن جب یہ حالت نہیں رہی تو وہ فیصلہ بھی نہیں رہا ۔ چنانچہ خاص اسلامی شہروں میں اس کثرت سے گرجا ، بت خانے ، آتش کدے بنے کہ ان کا شمار نہیں ہو سکتا ۔ بغداد خاص مسلمانوں کا آباد کیا ہوا شہر ہے ۔ وہاں کے گرجوں کے نام معجم البلدان میں کثرت سے ملتے ہیں ۔ قاہرہ میں جو گرجے ہیں وہ مسلمانوں ہی کے عہد میں بنے ۔ یوٹکیس نے جو ۳۲۱ھ میں اسکندریہ کا لارڈ بشپ تھا ، اپنی کتاب میں جو عربی زبان میں ہے اور جس کو پروفیسر پوکاک نے لاطینی ترجمہ کے ساتھ چھاپا ہے ، اس قسم کے بہت سے گرجوں کا نام اور ان کے حالات لکھے ہیں ۔

خالد بن عبداللہ قسری نے جو ہشام بن عبدالملک کے زمانہ میں عراقین کا گورنر تھا اور عرب کے نہایت نامور لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔ اپنی ماں کے لئے جو عیسائی مذہب رکھتی تھی ۔ خود ایک گرجا تعمیر کرا دیا تھا ۔ عضدالدولہ نے جو بہت بڑا نامور شہنشاہ گذرا ہے اور نہایت صاحب فضل و کمال تھا ۔ اپنے وزیر نصر بن ہارون کو چرچ اور گرجاؤں کے بنانے کی عام اجازت دی تھی (۱) چنانچہ اس نے ۳۶۹ھ میں نہایت کثرت سے تمام ممالک اسلامیہ میں چرچ اور گرجے تعمیر کرائے ۔

مسلمانوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ پرانے معبد قائم رکھے یا نئے معبدوں کی تعمیر کی اجازت دی ۔ بلکہ انھوں نے نہایت انصاف سے معبدوں کے متعلق تمام حصے اور تمام وہ جائدادیں بحال رہنے دیں جو ان معبدوں پر وقف تھیں ۔ یہاں تک کہ پجاریوں اور مجاوروں کے جو روزینے پہلے سے مقرر تھے ۔ وہ بھی اپنے خزانے سے جاری رکھے ۔ عمرو بن العاصؓ نے حضرت عمرؓ کے عہد میں جب مصر فتح کیا تو جس قدر آراضیات گرجاؤں پر وقف تھیں ۔ اسی طرح بحال رہنے دیں ۔ چنانچہ اس قسم کی جو آراضیات ۸۰۰ھ تک موجود تھیں ۔ ان کی تعداد ۱۰ ہزار فدان تھی (۲) محمد قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو برہمنوں کو بلا کر بت خانوں کے متعلق ان کو جو اختیار دیئے اس کو مورخ علی بن حامد

---

(۱) ابن الاثیر واقعات ۳۶۹ھ ج ۸ ص ۵۱۸ (۲) دیکھو مقریزی ج ۲ ص ۴۹۴

نے اپنی تاریخ سندھ میں ان الفاظ میں لکھا ہے۔

"پس اکابر و مقدمان دولت براہمہ را فرمود کہ معبود خود را عبادت کنند و فقراے برہمنان را بہ احسان و تصدق تیمار دارند و عیاد و مراسم خود بہ شرع نمایند و بجا آرند قیام نمایند و صدقاتے کہ پیش تر بہ ایشان میدادند بہ برہمنان بدہند بہ قرار قدیم بدہند۔"

بنیامین جو مصر کا پیٹریارک تھا اور ایرانیوں کے تسلط کے زمانے میں مصر سے بھاگ گیا تھا۔ اس کو خود عمرو بن العاصؓ نے سنہ ۲۰ھ میں امان کی تحریر بھیج کر مصر میں بلوا لیا اور پیٹریارک کے عہدے پر مامور کیا (۱) محمد فاتح نے جب سنہ ۸۵۷ھ میں قسطنطنیہ فتح کیا تو یونانی کلیسا کا خود محافظ بنا اور تمام پادریوں کو ہر قسم کے قانون کے احکام سے بری کر دیا۔

اسلام میں غیر مذہب والوں کے مذہبی احکام کا جو لحاظ کیا جاتا تھا اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ یہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی عیسائی ایک گرجا بنانے کی وصیت کر جائے تو اسلامی عدالت اس وصیت کو جائز تسلیم کرے گی اور مسجد بنانے کی وصیت کر جائے تو ناجائز۔ چنانچہ صاحب ہدایہ نے باب الوصیۃ میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ مذہب نقل کرکے ان کی طرف سے یہ دلیل پیش کی ہے نحن امرنا بان نترکھم وما یدینون یعنی ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم غیر مذہب والوں کو ان کے احکام مذہبی پر چھوڑ دیں۔ ایک دفعہ جب حضرت ابو بکرؓ کے عہد میں ایک عورت نے مسلمانوں کی ہجو کے اشعار گائے اور ایک افسر نے اس جرم پر اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے تو حضرت ابو بکرؓ نے اس افسر کو خط لکھا کہ اگر وہ عورت مسلمان تھی تو کوئی معمولی سزا دینی چاہیئے تھی اور اگر ذمی تھی تو جب ہم نے اس کے شرک اور کفر سے درگذر کی تو ہجو تو شرک سے بہرحال کم ہے۔ (۲)

عیسائی نکتہ چینوں کی نسبت ہم کو صرف یہی شکایت نہیں کہ وہ اسلامی تاریخوں سے ناآشنا ہیں بلکہ افسوس یہ ہے کہ وہ خود اپنے قدیم عیسائی بزرگوں کی روشن

---

(۱) مقریزی ج ۲ ص ۴۹۲ (۲) طبری واقعات سنہ ۱۱ھ ج ۴ ص ۲۰۱۰، ۲۰۱۲

سے واقفیت نہیں رکھتے۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مرو کا جو بیٹریارک تھا اور جس کا نام (ISHO JAHB) تھا۔ اس نے ایران کے بڑے بشپ (SIMEON) کو جو خط لکھا تھا اس میں یہ الفاظ تھے، "عرب جن کو خدا نے اس وقت جہاں کی بادشاہت دی ہے۔ عیسائی مذہب پر حملہ نہیں کرتے۔ بلکہ برخلاف اس کے وہ ہمارے مذہب کی امداد کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور خداوند کے مقدسوں کی عزت کرتے ہیں اور گرجوں اور خانقاہوں کے لئے عطیے دیتے ہیں"۔

مذہبی اور قانونی حقوق کے بعد جن کا ہم اوپر ذکر کر چکے، یہ امر زیادہ قابل لحاظ ہے کہ ذمیوں کو رتبہ اور اعزاز کے لحاظ سے اسلامی گورنمنٹ اور اسلامی پبلک میں کیا درجہ حاصل تھا۔ فاتح اور مفتوح کی تمیز ایک ایسا فطری امر ہے، جو کسی طرح کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتا۔ پچھلی دنیا میں تو یہ امتیاز اس حد تک پہنچا تھا کہ فاتح قوموں نے ہمیشہ مفتوحین کو جانوروں سے کچھ ہی زیادہ سمجھا۔ ہنود آرین ہندوستان میں آئے تو یہاں کے اصلی باشندوں کو اس طرح خاک میں ملا دیا کہ ان کو شودر کے لقب سے خود عاجز نہیں دیا۔ روم نے تمام مفتوح قوموں کو گویا غلام بنا رکھا تھا۔ دنیا اسی حالت میں تھی کہ اسلام کا قدم آیا، اس کے گرد و پیش ہر طرف اسی قسم کی مثالیں موجود تھیں۔ لیکن اس نے کیا کیا؟ یہ کیا کہ دنیا کے اس رواج یافتہ قاعدے کو دفعتہً مٹا دیا اور قول و فعل دونوں سے بتا دیا کہ حقوق عامہ میں جس قدر آدمی آسمان کے نیچے ہیں، سب برابر ہیں۔ اسلام ہی نے یہ بات سکھلائی تھی کہ جب ایک یہودی نے حضرت علیؓ پر خود ان کی خلافت کے زمانہ میں ایک زرہ کا دعویٰ کیا تو جناب ممدوح کو اس کی جواب دہی کے لئے عدالت میں حاضر ہونا پڑا اور وہ بغیر کسی عذر کے معمولی فریق مقدمہ کی حیثیت سے عدالت میں حاضر ہوئے۔ یہ اسلام ہی کی تعلیم تھی کہ جب ایک عیسائی نے ہشام بن عبدالملک پر جو بڑی عظمت اور اقتدار کا خلیفہ گذرا ہے ایک جائداد کا دعویٰ کیا اور حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز کے دربار میں مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے ہشام کو عدالت میں طلب کیا اور کہا کہ مدعی کے برابر کھڑے ہو کر جواب دہی کرو۔ ہشام نے

وکیل مقرر کرنا چاہا۔ حضرت عمرؓ نے کہا نہیں، تم خود سامنے کھڑے ہو کر جواب دو۔ جبلہ نے عیسائی کے ساتھ سخت کلامی شروع کی۔ حضرت عمرؓ نے نہایت سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو بغیر سزا دیئے نہ چھوڑوں گا۔ چونکہ روداد سے عیسائی کا حق ثابت تھا، اس کو ڈگری دلائی اور حکم دیا کہ جاجام کی دستاویز جو اس نے جبلہ کی تھی چاک کر دی جائے (۱) تاریخ اسلام میں اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہیں، لیکن ہم نے صرف ان بزرگوں کے نمونے پیش کئے ہیں جو خود اسلام کے نمونے تھے۔

اسلامی حکومتوں میں مسلمان اور ذمی عموماً برابری کی حیثیت سے رہتے تھے، سرکاری مناصب میں، مجالس عامہ میں، عام معاشرت میں، فاتح مفتوح کی کچھ تمیز نہ تھی، لیکن قبل اس کے کہ ہم اس دعوی کو تفصیلی طور سے ثابت کریں ہم کو ان شبہات کا جواب دینا چاہئے جو اس موقع پر خواہ مخواہ پیدا ہوں گے۔ عیسائی مصنفین نے ہمیشہ نہایت زور کے ساتھ اسلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ اس نے دوسری قوموں کو نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا اور ذلت کی مخصوص علامتیں قائم کیں، اسلام نے یا اسلام کے جانشینوں نے یہ قاعدہ بنا دیا کہ ذمی ایک خاص قسم کا لباس اختیار کریں جو ان کی محکومی اور ذلت کی علامت ہو، گھوڑے پر نہ سوار ہوں، راستے میں ادباً مسلمانوں سے بچ کر نکلیں، بڑے بڑے عہدے نہ پائیں، ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہ کیا جائے۔

ہم بے شبہ تسلیم کرتے ہیں کہ فقہ کی پچھلی تصنیفات میں ذمیوں کی نسبت یہ احکام موجود ہیں، لیکن ہمارا یہ دعوی ہے کہ یہ احکام خدا کے، رسول کے، صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام نہیں ہیں، نیز اس کے ساتھ ہمارا یہ بھی دعوی ہے کہ یہ احکام کسی زمانے میں رواج نہیں پائے، کسی کسی ظالم بادشاہ نے جوش تعصب میں اس قسم کی کارروائی کی تو وہ اسی حد تک رہی، مورخین نے عام طور پر لکھا ہے کہ سب سے پہلے جس نے ذمیوں کا لباس بدلا وہ متوکل باللہ عباسی تھا، اس سے تو یہ امر ظاہر ثابت ہے کہ متوکل باللہ سے پہلے یہ لباس نہ تھا، متوکل نے ذمیوں پر اور بھی طرح طرح کی سختیاں کیں،

(۱) [illegible] ص ۹۰

لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وہی متوکل ہے جس نے حضرت امام حسینؑ کے مزار مبارک کو کھدوا کر خاک کے برابر کر دیا اور منادی کرا دی کہ کوئی شخص زیارت کو نہ آنے پائے، جس شخص نے خود جگر گوشۂ رسولؐ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہو، اس کے کس فعل پر کیا استدلال ہو سکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ حضرت عمرؓ فاروق نے بھی ذمیوں کے لئے ایک خاص لباس کی تعیین کی تھی، لیکن یہ وہی لباس تھا جو مدت سے ان کا قومی لباس چلا آتا تھا اور اس وجہ سے یہ قیاس نہیں ہو سکتا کہ اس سے تحقیر اور ذلت مقصود تھی۔ اس بحث کو ہم نے مختصراً سیرۃ النعمان میں لکھا ہے اور انشاء اللہ الفاروق میں اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دیں گے۔ یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ حضرت عمرؓ کا یہ حکم آیا کوئی مذہبی اور استقلالی حیثیت رکھتا تھا یا صرف ان کا مذاق طبیعت تھا، جس کے معنی صرف یہ تھے کہ ہر قوم اپنی قومی خصوصیتوں پر قائم رہے۔

اس امر کے فیصلہ کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ لباس کے بارے میں حضرت عمرؓ کے احکام کس حد تک عمل میں آئے۔

حضرت عمرؓ نے جہاں غیر قوموں کو عرب کے لباس کے اختیار کرنے سے روکا تھا، اہل عرب کو بھی عجم کی وضع سے پرہیز کرنے کی تاکید کی تھی، چنانچہ عتبہ بن فرقد کو جو فرمان لکھا تھا اس میں یہ الفاظ تھے "علیکم بلباس ابیکم اسمعیل وایاکم والتنعم وزی العجم واقطعوا الخفاف والقوا السراویل" یعنی تم کو اپنے باپ اسمعیل کا لباس پہننا چاہئے، خبردار عیش طلبی اور اہل عجم کی وضع نہ اختیار کرنا، موزہ اور پاجامہ پہننا چھوڑ دو۔

لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ بیت المقدس کے معاہدہ کے لئے شام تشریف لے گئے تو تمام افسران فوجی رومیوں کے لباس میں تھے، اس پر ناراضی بھی ظاہر فرمائی، لیکن جب ان لوگوں نے اس کا سبب بتایا تو چپ ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ جب مصر فتح ہوا تو اہل فوج کی خوراک و لباس کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ عیسائی ہر سال

قبا اور کپڑوں کی ایک تعداد مقررہ جزیہ کے ساتھ ادا کرتے رہیں ان کپڑوں میں عمامہ اور جبہ کے ساتھ موزے اور پاجامے بھی شامل تھے (۱) حالانکہ موزہ اور پاجامے کے استعمال کو حضرت عمرؓ اپنے سابق فرمانوں میں منع کر چکے تھے، حضرت عمرؓ کی ان دو مختلف کارروائیوں کی تاویل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اول اول ان کی وہ رائے تھی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ طبائع کے میلان فطری کو وہ روک نہیں سکتے تو انھوں نے اس خیال کو جانے دیا۔

غیر قوموں کو حضرت عمرؓ نے جو روک ٹوک کی تھی وہ بھی نہ چل سکی، عیسائیوں اور یہودیوں نے مسلمانوں کی بہت سی خصوصیتیں اختیار کر لیں یہاں تک کہ عمرؓ بن عبدالعزیزؒ نے جو حضرت عمرؓ کے قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے، اپنے ایک عامل کو لکھا کہ وقد ذکر لی ان کثیرا ممن قبلک من النصاری قد راجعوا لبس العمائم وترکوا المناطق (۲) یعنی مجھ کو معلوم ہے کہ اکثر عیسائی عمامے باندھنے لگے ہیں اور پیٹیاں لگانی چھوڑ دی ہیں۔

ایک خاص قابل لحاظ یہ بات ہے کہ مسلمان جہاں جہاں گئے اور جہاں جہاں ان کی حکومتیں قائم ہوئیں، انھوں نے خود مفتوح قوموں کا لباس اختیار کر لیا اور یہ ظاہر ہے کہ اگر ان کا لباس ذلت اور تحقیر کی علامت ہوتا تو مسلمان ذلت اور تحقیر کو کیوں گوارا کرتے۔ عباسیوں کی سلطنت کا آغاز درحقیقت منصور کے عہد سے گنا جاتا ہے، اس نے دربار کے لیے جو ٹوپی اختیار کی وہ وہی مجوسیوں کی ٹوپی تھی، جو خاص ان کی قومی علامت تھی۔ معتصم باللہ جس کے زمانے میں دولت عباسیہ پورے شباب پر پہنچ گئی تھی، اس نے بالکل شاہان عجم کی وضع اختیار کر لی تھی۔ مورخ مسعودی نے لکھا ہے، وغلب علیه حب الفروسیة والتشبه بالملوک الاعاجم فی الآلة ولبس القلانس والشاشیات فلبسها الناس اقتداء بفعله و ائتماما به فسمیت المعتصمیات (۳) یعنی وہ

(۱) فتوح البلدان ص ۱۲۵ (۲) کتاب الخراج ص ۷۳ (۳) مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ ج ۸ ص ۳۰۲

ٹوپی اوڑھتے، پگڑی باندھتے، اسلحہ و سامان رکھنے میں رئیسان عجم کی تقلید کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ان کو دیکھ کر سب نے یہ وضع اختیار کی اور اس وضع کا نام معتضدی پڑ گیا۔

سندھ وغیرہ میں جب عربوں کی حکومت قائم ہوئی اور اس کے مختلف حصوں میں خاص عرب کی نسل کے سلاطین فرماں روا ہوئے تو تمام مسلمانوں نے ہندوؤں کی وضع اختیار کرلی، چنانچہ ابن حوقل بغدادی جس نے چوتھی صدی کے آغاز میں ان ممالک کا سفر کیا تھا، مکران کی نسبت اپنے جغرافیہ میں لکھتا ہے "وزی المسلمین والکفار بھا واحد فی اللباس و ارسال الشعر" یعنی یہاں مسلمان اور کافروں کی ایک وضع ہے، دونوں ایک سا لباس پہنتے ہیں اور بال بڑھے رکھتے ہیں۔

وہی مؤرخ سندھ اور منصورہ کی نسبت لکھتا ہے "و زیھم زی اھل العراق الا ان زی ملوکھم یقارب زی ملوک الھند" یعنی کے مسلمانوں کا لباس عراق کا سا ہے۔ لیکن یہاں کے بادشاہوں کی وضع ہندو راجوں کے قریب قریب ہے۔

مخالفوں کی طرف سے بلکہ خود متعصب مسلمانوں کی طرف سے یہ استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہ حکم دیا تھا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو سلام نہ کرو، چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ ناواقفی سے ایک عیسائی کو سلام کیا تو پھر اس سے جا کر کہہ آئے کہ تو میرا سلام پھیر دے، یہ اور اس قسم کی روایتیں بہت زیادہ شہرت پکڑ گئی ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ان راز سے بالکل پردہ اٹھا دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں جو یہودی رہتے تھے ان میں اس قدر تعصب تھا کہ بات بات میں اس کا اثر پایا جاتا تھا، وہ مسلمانوں کو سلام کرتے تھے تو السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تم کو موت آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ جب یہودی اس طرح سے سلام کریں تو تم صرف یہ کہو کہ علیکم یعنی "تم پر" (۱) یہی روایت ہے جو مختلف پیرایوں میں ادا کی گئی ہے اور جس کا اصل صرف یہ ہے کہ جس طرح لوگ تم سے پیش

(۱) ادب مفرد امام بخاری ص ۲۰

آمیں تم بھی ان سے اسی طرح پیش آؤ" یہ شبہ عبداللہ بن عمرؓ نے سلام لے کر واپس لیا تھا۔ لیکن اول تو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ وہ عیسائی ذمی یعنی اسلام کی رعیت تھا اور ہماری بحث یہاں صرف ذمیوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ دوسرے اصلی بات یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کی یہ ذاتی رائے تھی اور دوسرے صحابہ جو علم و فضل تحقیق و اجتہاد میں ان سے بہت بڑھ کر تھے، ان کی رائے اس کے بالکل خلاف تھی۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جن کو بحر العلم کا خطاب ملا تھا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص یہودی ہو یا عیسائی یا آتش پرست، سب کے سلام کا جواب اسی طرح دینا چاہیے، جس طرح وہ تم کو سلام کرتا ہے۔ کیوں کہ خدا نے خود فرمایا ہے کہ اِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا (نساء ۴ : ۸۶) یعنی جب تم کو کوئی شخص سلام کرے تو تم اس سے زیادہ عمدہ طور پر اس کا جواب دو یا عمدہ طور سے نہیں تو برابر طور سے سہی۔ عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول امام بخاری نے ادب المفرد میں نقل کیا ہے۔ ابو موسیٰ اشعری جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے، انہوں نے ایک عیسائی راہب کو خط لکھا تو سر نامہ پر سلام لکھا، اس پر ایک شخص نے اعتراض کیا، انہوں نے جواب دیا کہ اس نے مجھ کو خط میں سلام لکھا تھا تو میں نے بھی لکھا۔ امام بخاری نے ادب المفرد عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کر کے لو قال لی فرعون بارک اللہ فیک قلت و فیک یعنی اگر فرعون بھی مجھ کو یہ دعا دے کہ خدا تجھ کو برکت دے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ خدا تجھ کو برکت دے۔ (۱)

حاصل یہ کہ اسلام کا یہ اصول تھا اور اسی پر ہمیشہ عمل درآمد رہا کہ جو قوم جس طرح اسلام کے ساتھ پیش آتی تھی، اسلام بھی اس کے ساتھ اسی طرح پیش آتا تھا، جو عیسائی یا یہودی وغیرہ دوستانہ اور منصفانہ برتاؤ کرتے تھے، ان کے ساتھ اسی طریقے سے برتاؤ کیا جاتا تھا، البتہ اسلام میں عیسائیوں کی طرح یہ فیاضی نہیں ہے کہ کوئی شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو وہ دوسرا گال پھیر دے کہ لو یہ بھی حاضر ہے۔

(۱) کتاب الادب المفرد ص ۱۶۳

ذمیوں کو معاشرت کے تمام امور میں جو مساویانہ درجہ حاصل تھا، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ اسلامی تذکروں میں جہاں کسی صاحب علم عیسائی یا یہودی کا ذکر آتا ہے تو اس کا نام اسی عزت اور مدح آمیز طریقہ سے لیا جاتا ہے، جس طرح ایک مسلمان اہل کمال کا لیا جا سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر مذہب کی تصریح نہ ہو تو کسی طرح امتیاز نہیں ہو سکتا کہ یہ کسی مسلمان کا تذکرہ ہے یا کسی غیر مذہب کے آدمی کا۔ بختیشوع، جبرئیل، سلمویہ، حنین بن اسحاق، یوحنا بن ماسویہ، ابو اسحاق صابی کا تذکرہ اسلامی تاریخوں میں جس عظمت سے کیا گیا ہے، ان کتابوں کے پڑھنے سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں اس موقع پر نمونے کے لئے صرف ابن التلمیذ کی نسبت جو بغداد کا ایک معزز عیسائی تھا، مؤرخان اسلام کے چند فقرے نقل کرتا ہوں۔ عماد کاتب نے جو سلطان صلاح الدین کا میر منشی تھا، اس کو سلطان الحکماء کے لقب سے مخاطب کر کے یہ الفاظ لکھے ہیں، ورایتہ وھو شیخ بھی المنظر حسن الرواء لطیف الروح بعید الھم، عالی الھمۃ، مصیب الفکر حازم الرای وکنت اتعجب فی امرہ کیف حرم الاسلام مع کمال فھمہ وغزارۃ علمہ۔ (۱)

کیا کوئی قوم کسی دوسری قوم کا ذکر اس سے زیادہ مدح اور تعریف کے ساتھ کر سکتی ہے، آج کل کے مقدس علماء کے آگے اگر دنیاوی حیثیت میں بھی کسی انگریز کا ذکر مدح کے ساتھ کیا جائے تو وہ اس کو اسلامی شان کے خلاف سمجھیں گے، مگر اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ ان کو تاریخ پر نظر نہیں اور ان کو معلوم نہیں کہ وہ جن بزرگوں کے نام لیوا ہیں، ان کا طریق عمل کیا تھا۔

خلفائے عباسیہ کے دربار میں غیر مذہب والوں کو جو اعزاز اور رتبہ حاصل تھا اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ عباسیوں کے دربار کا یہ خاص آئین تھا کہ کسی شخص کا نام دربار میں لقب یا کنیت کے ساتھ نہیں لیا جاتا تھا، اس قاعدے سے کوئی

---

(۱) ابن خلکان نے کتاب الخریدہ کے حوالہ سے مذکورہ بالا عبارت میں ترمیم کر کے بعینہ وہی الفاظ نقل کئے ہیں۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور، تذکرہ ابن التلمیذ ج ۲ ص ۱۹۰۔ ک۔

ایسا ہی بڑی عزت اور مرتبے کا آدمی مستحق ہو سکتا تھا۔ یہاں تک کہ اکثر بڑے بڑے علما کو یہ عزت نصیب نہیں ہوتی تھی۔ باوجود اس کے ہارون الرشید، جبریل بن بختیشوع کا تمام دربار میں کلیت کے ساتھ لیا تھا۔ ہارون الرشید نے عام حکم دے دیا تھا کہ جس شخص کو مجھ سے کچھ کہنا ہو یا کوئی عرض پیش کرنی ہو تو جبریل بن بختیشوع کے ذریعے سے کرے۔ چنانچہ بڑے بڑے افسران فوجی ہارون رشید سے جو کچھ عرض معروض کرتے تھے، جبریل کے ذریعہ سے کرتے تھے۔ (۱) متوکل باللہ نے باوجود اس کے ذمیوں کی نسبت سخت احکام جاری کئے تھے۔ تاہم اس کے دربار میں ذی اہل کمال کو یہ عزت حاصل تھی کہ بختیشوع دربار میں خود متوکل کا سا لباس پہن کر آتا تھا (۲) اور اکثر صحبتوں میں متوکل کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ بختیشوع متوکل کی خدمت میں حاضر ہوا تو اتفاق سے وہ اس وقت دیوان خاص کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ بختیشوع بھی وہیں چوکھٹ پر اسکے برابر بیٹھ گیا (۳) سلمویہ بن بنان کو جو عیسائی مذہب رکھتا تھا۔ معتصم باللہ کے دربار میں یہ عزت حاصل تھی کہ معتصم کے جس قدر فرمان صادر ہوتے تھے۔ سلمویہ کے دستخط سے ہوتے تھے۔ علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطباء میں سلمویہ کی نسبت معتصم کا یہ فقرہ نقل کیا ہے۔ اکبر عندی من قاضی القضاۃ۔ یعنی سلمویہ میرے نزدیک قاضی القضاۃ سے بڑھ کر ہے۔ سلمویہ جب بیمار ہوا تو معتصم خود عیادت کو گیا اور افسوس کے ساتھ رو دیا۔ سلمویہ نے جب وفات کی تو اس رنج میں تمام دن کھانا نہیں کھایا اور حکم دیا کہ اس کا جنازہ دیوان شاہی میں لا کر رکھا جائے اور عیسائی مذہب کے موافق شمع اور بخور جلا کر اس کے جنازے کی نماز پڑھی جائے۔ (۴)

خلیفہ المعتضد باللہ کے دربار میں جہاں تمام وزرا امراء دست بستہ کھڑے رہتے تھے، صرف وزیر اعظم اور ثابت بن قرہ کو بیٹھنے کی اجازت تھی، حالانکہ ثابت بن قرہ

(۱) عیون الانباء فی طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۲۷ (۲) ایضاً ص ۱۴۰ (۳) ایضاً ص ۱۴۰

(۴) ایضاً ص ۱۶۵

مذہباً صابی اور ذمی تھا۔ ایک دن معتضد ثابت بن قرہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر ٹہل رہا تھا۔ دفعتہً معتضد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ ثابت خوف سے کانپ اٹھا۔ معتضد نے کہا۔ ڈرو نہیں۔ میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ کے اوپر تھا۔ لیکن چونکہ تم علم و فضل میں مجھ سے بڑھ کر ہو اس لئے تمہارا ہاتھ اوپر ہونا چاہیئے"۔

سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس، نہایت پابند شریعت اور متقی و پرہیز گار تھا۔ اس کے دربار میں کثرت سے عیسائی تھے اور وہ ان کی نہایت عزت و توقیر کرتا تھا۔ انہیں میں سے ابن المطران ایک عیسائی تھا۔ صلاح الدین کی عادت تھی کہ وہ لڑائی کے معرکوں میں ایک سرخ خیمہ نصب کراتا تھا اور جب لڑائی سے فارغ ہوکر بیٹھتا تھا تو اس خیمے میں بیٹھتا تھا۔ چونکہ یہ امتیاز کی علامت تھی اس لئے حکم تھا کہ اور کوئی شخص اس رنگ کا خیمہ نہ رکھے۔ ابن المطران چونکہ شان و شوکت اور تمام باتوں میں خود سلطان صلاح الدین کی ہمسری کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنا خیمہ بھی سرخ رنگ کا تیار کرایا اور اسی میں بیٹھا کرتا تھا۔ صلاح الدین نے دیکھا تو کہا کہ مجھ کو اس سے کوئی اعزاز مقصود نہیں تھا۔ صرف ضرورت کی وجہ سے ایسا کیا گیا تاکہ لوگ میرے خیمہ کو بآسانی پہچان لیں۔ یہ کہہ کر اس کا خیمہ اکھڑوا دیا۔ ابن المطران اس پر سخت برہم ہوا اور دو دن تک دربار میں نہ آیا۔ آخر صلاح الدین نے بڑی استمالت سے اس کو راضی کیا۔ اس قسم کی سینکڑوں مثالیں ہیں۔ کوئی کہاں تک گنوائے۔

یورپ والو! اگر اسلامی حکومتوں میں ذمیوں کی اسی طرح ذلت اور تحقیر کی جاتی تھی تو کاش تم اپنی مفتوحہ قوموں کے ساتھ اسی ذلت اور تحقیر کا برتاؤ کرتے۔

اعزاز اور توقیر کی نسبت شاید کہا جائے کہ یہ پالیٹکس کی بنا پر تھا۔ اس لئے ہم یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ اسلام اور بانیان اسلام ذمیوں کی نسبت دلی ہمدردی اور غمخواری کے کیا خیالات رکھتے تھے۔ ذمیوں کی نسبت اگرچہ ہر قسم کے معاملات حضرت عمرؓ کے عہد میں منضبط ہوئے اور زمانہ مابعد میں برابر انہیں کا طرز عمل، سچے مسلمانوں کا طرز عمل رہا۔ لیکن ابتدا خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

زبان مبارک سے ہو چکی تھی اور اس وجہ سے ہم کو اس باب میں خود شریعت کا طرز عمل معلوم ہو سکتا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں یہ حدیث روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ارقم کو جزیہ کے وصول کرنے پر مقرر کیا تو ان کو بلا کر فرمایا: "الا من ظلم معاھدا او کلفه فوق طاقته او انتقصه و اخذ منه شیئا بغیر طیب نفسه فانا حجیجه یوم القیامة" [1] یعنی جان لو کہ جو شخص کسی معاہد (یعنی ذمی) پر ظلم کرے گا یا اس سے اس کی طاقت سے زیادہ کام لے گا یا اس کو ذلیل کرے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے بغیر لے گا تو میں قیامت کے دن اس کا دشمن ہوں گا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا یہ اثر تھا کہ صحابہ جہاں کہیں ذمیوں پر کسی قسم کی سختی ہوتی دیکھتے تھے، فوراً مواخذہ کرتے تھے۔ سعید بن زید نے ایک دفعہ دیکھا کہ ذمیوں سے مال گذاری وصول کرنے کے لئے دھوپ میں کھڑا کیا گیا ہے، اسی وقت وہاں کے حاکم سے جا کر کہا کہ میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص لوگوں کو عذاب دیتا ہے، خدا اس کو عذاب دے گا۔ ہشام بن حکیم کو بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا اور انہوں نے اسی وقت حاکم وقت یعنی عیاض بن غنم کے پاس جا کر ملامت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی قول سند میں پیش کیا [2]۔

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے شخص کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا۔ اس سے پوچھا کہ تیرا کیا مذہب ہے؟ اس نے کہا یہودی۔ فرمایا بھیک کیوں مانگتا ہے؟ بولا کہ تنگی اور مفلسی کی وجہ سے اور جزیہ کے ادا کرنے کے لئے۔ حضرت عمرؓ اس کو اپنے ساتھ اپنے مکان پر لا گئے اور کچھ نقد اپنے پاس سے دے کر بیت المال کے افسر کے پاس کہلا بھیجا کہ "انظر هذا و ضرباءه فو اللہ ما انصفناه ان اکلنا شبیبته ثم نخذله عند الهرم انما الصدقات للفقراء و المساکین و الفقراء

---

[1] کتاب الخراج ص ۷۲ [2] ایضاً ص ۷۱

هم المسلمون وهذا من المساكين من اهل الكتاب " یعنی یہ بوڑھے
اور اس کے اور ساتھیوں پر خیال کرو، خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم نے ان کی
جوانی کی کمائی ہم نے کھائی اور اب یہ بوڑھا ہوگیا ہے تو اس کو ہم نکال دیں۔ صدقے
کی نسبت جو خدا نے کہا ہے کہ فقیروں اور مسکینوں کو دینا چاہئے تو فقیروں سے مسلمان
اور مسکینوں سے اہل کتاب مراد ہیں۔ [۱]

حضرت عمرؓ کی ہمدردی اور رحم کا جو ان کو ذمیوں کے ساتھ تھا اس
سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ باوجود اس کے کہ وہ ایک ذمی کے ہاتھ سے مارے گئے
تھے، تاہم ذمیوں کا ان کو خیال تھا کہ وفات کے وقت نہایت ضروری وصیتیں جو
کیں ان میں ایک یہ تھی کہ ذمیوں کے ساتھ جو اقرار ہیں وہ پورے کئے جائیں، ان کی
طاقت سے زیادہ کام ان سے نہ لیا جائے اور ان کے دشمنوں کے مقابلے میں ان کی
طرف سے لڑائی کی جائے۔ [۲]

عراق میں حضرت عمرؓ نے جو خراج مقرر کیا تھا، گرچہ نہایت خفیف تھا، تاہم
ان کا ہمیشہ خیال رہا کہ تشخیص مال گذاری میں ذمیوں پر سختی تو نہیں کی گئی۔ چنانچہ
جن لوگوں نے زمین کی پیمائش کر کے جمع تشخیص کی تھی، ان کو اکثر بلا کر اس کی نسبت پوچھا
کرتے تھے۔ خراج جب آتا تھا تو دس ثقہ شخص بصرے سے اور دس کوفے سے طلب کئے جاتے
تھے، حضرت عمرؓ ان سے حلف لیتے تھے اور جب وہ چار دفعہ شرعی قسم کھا کر کہتے تھے کہ
مال گذاری کے وصول کرنے میں ذمیوں پر سختی نہیں کی گئی ہے تب ان کو تسکین ہوتی
تھی، مسلمانوں کو ذمیوں کے ساتھ جو ہمدردی تھی۔ اس کے لئے اس قسم کی سینکڑوں
جزوی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان سب کا استقصا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہم ایک دو
واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں جس سے تابعین سلف کی عام رائے کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جزیرہ سائپرس جب ۲۸ھ میں فتح ہوا تو شرط یہ ٹھہری کہ وہاں کے لوگ
مسلمانوں اور رومیوں کے باہمی معرکوں میں کسی کا ساتھ نہ دیں گے لیکن ۳۳ھ میں

---

(۱) کتاب الخراج ص ۷۲ (۲) حضرت عمرؓ کے اس قول کو امام بخاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔

انھوں نے مسلمانوں کے برخلاف رومیوں کو مدد دی، امیر معاویہ نے ان پر چڑھائی کی اور شہر کو فتح کر کے پہلی شرط پر پھر صلح کرلی، لیکن وہ اپنی شرارت سے پھر باز نہ آئے، اس پر ولید بن یزید نے ایک گروہ کو جلا وطنی کی سزا دی، اگرچہ وہ اس سزا کے فی الحقیقت مستحق تھے، لیکن ان کی سازش کا ثبوت قطعی نہ تھا، تمام مسلمان اور علماء اور فقہاء ولید کی اس حرکت پر سخت برہم ہوئے کہ ذمیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا جائز نہیں، چنانچہ ولید کے بعد جب اس کا بیٹا تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے ان سب کو واپس بلا لیا اور تمام مسلمانوں نے ولید کی اس کارروائی کی تحسین کی، دولت عباسیہ کے زمانے میں وہاں کی رعایا نے پھر بغاوت کا ارادہ کیا، اس وقت عبدالملک بن صالح گورنر تھا اور بڑے بڑے نامور ائمہ موجود تھے، مثلاً لیث بن سعد، امام مالک، سفیان بن عیینہ، موسیٰ بن اعین، اسماعیل بن عیاش، یحییٰ بن حمزہ، ابو اسحاق فزاری، مخلد بن حسین وغیرہ موجود تھے، عبدالملک نے ان سب کے پاس استفتاء بھیجا اور پوچھا کہ قاعدہ شریعت کی رو سے ان سے کیا سلوک کرنا چاہیئے، علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں ان اماموں کے فتوے الگ الگ ان کے الفاظ میں نقل کئے ہیں، اکثروں نے تو یہی رائے دی کہ ان سے درگذر کرنا چاہیئے، کیونکہ فقط ارادہ بغاوت سے وہ ذمیت کے حقوق سے محروم نہیں ہوگئے، لیکن جن بعض بزرگوں نے سختی کی انھوں نے بھی صرف یہ اجازت دی کہ ان کو سال بھر کی مہلت دی جائے، اگر اس مدت میں وہ پورے مطیع ہو جائیں تو بہتر ورنہ ان کو کہہ دیا جائے کہ رومیوں کے ملک میں چلے جائیں، یحییٰ بن حمزہ اور ابو اسحاق فزاری و مخلد بن الحسین نے یہ فتویٰ دیا کہ ان لوگوں کے پاس جس قدر مال و اسباب اور زمین وغیرہ ہے ایک ایک چیز کی دو گنی قیمت بیت المال سے ادا کی جائے اور ان کو کہہ دیا جائے کہ وہ اور کہیں جا کر آباد ہو جائیں، اسماعیل بن عیاش نے لکھا کہ وہ بیچارے رومیوں کے مظلوم ہیں، اس لئے ہم کو ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ ان بزرگوں کے فتوؤں اور رایوں سے بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ذمیوں کے ساتھ اسلام کا کیا برتاؤ تھا۔

سب سے اخیر ملکی حقوق کی ہے۔ یعنی یہ کہ ذمیوں کو انتظام سلطنت میں کہاں تک دخل تھا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ شروع سے اس بحث میں ہمارے مخاطب عیسائی ہیں جن کا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام غیر مذہب والوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کا حکم دیتا ہے۔ اس لئے ہم ملکی حقوق کی بحث میں یورپ کے نظام سلطنت سے موازنہ کریں گے۔ کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک عدل و انصاف، تہذیب و شائستگی کا معیار یورپ اور یورپ کا اصول حکومت ہے۔

سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ملکی حقوق کی نسبت یورپ کی مہذب سے مہذب حکومتوں نے فاتح و مفتوح میں جو حد فاصل قائم کی ہے، وہ اسلامی حکومتوں نے کبھی نہیں کی۔ اسلام نے یا اسلامی حکومتوں نے کبھی یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ جو شخص ولایت زاد ہو اس کو فلاں قسم کے حقوق نہیں مل سکتے یا فلاں فلاں عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اسلام کے آغاز میں ملکی اور فوجی عہدے مختلف نہ تھے، جو شخص صوبہ کا گورنر ہوتا تھا، وہی سپہ سالار بھی ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ جو لوگ منصب قضا پر مامور ہوتے تھے، وہی ضرورت کے وقت فوج کے جنرل مقرر ہو کر بھیج دیئے جاتے تھے۔ تہذیب اور شائستگی کے تاریخ داں اس بات کو بخوبی جانتے ہیں کہ سلطنت جب اول اول قائم ہوتی ہے تو اس کے مختلف صیغے مدت تک باہم مخلوط رہتے ہیں۔ جس قدر تمدن زیادہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر تقسیم عمل کا اصول زیادہ عمل میں آجاتا ہے اور ہر ہر صیغہ جدا جدا صورت پکڑتا جاتا ہے۔ اسی کلیہ کے موافق اسلام کے ابتدائی زمانے میں بھی اس قسم کا اختلاط و التباس رہا اور اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ مفتوح قومیں ملکی انتظامات میں کم شامل ہو سکیں، کیونکہ اس وقت تک جس قدر ملکی عہدے تھے ان میں فوجی خدمات بھی شامل تھیں اور اس وجہ سے غیر قومیں خود ان پر خطر خدمات کو گوارا نہیں کرتی تھیں۔

اس موقع پر یہ امر قابل استفسار ہے کہ اگر غیر قوموں نے خود فوجی خدمتوں کو قبول کرنا چاہا تو اسلام نے ان کی خواہش کا کہاں تک لحاظ رکھا اور جواب یہ ہے کہ

اسلام نے بے تکلف ان کی درخواست منظور کی۔ حضرت عمرؓ کے وقت میں بارہا یہ موقعے پیش آئے کہ عیسائیوں اور آتش پرستوں نے باوجود اپنے مذہب پر قائم رہنے کے فوجی خدمتوں میں شامل ہونے کی درخواست کی اور حضرت عمرؓ نے نہایت خوشی سے ان کی درخواست کو منظور کر کے ان کو وہ تمام حقوق دیئے جو مسلمانوں کو حاصل تھے۔ لیکن ناظرین کو یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ ہم اس موقع پر ان واقعات کی تفصیل بھی بیان کریں گے، ورنہ الفاروق کے لئے کیا رہ جائے گا۔

بہرحال اسلام کے ابتدائی زمانے میں وہ خدمتیں اور عہدے جن میں فوجی حیثیت بھی شامل تھی، ذمیوں کو کم ملے، لیکن جس صیغے میں اس حیثیت کا لگاؤ نہ تھا وہ ذمیوں کے لئے کھلا رہا۔ بلکہ حق یہ ہے کہ وہ انھیں کے قبضہ اختیار میں رہا۔ خراج اور مال گذاری کے محکموں اور دفتر پر تمام تر عیسائی اور آتش پرست قابض تھے۔ یہاں تک کہ اس دفتر کی زبان بھی لاطینی اور فارسی و قبطی رہی۔ شام میں بہت دنوں تک دفتر خراج لاطینی زبان میں تھا اور اس وقت تک سرجون نام ایک عیسائی اس محکمہ کا افسر تھا۔ عراق کا دفتر حجاج بن یوسف کے زمانے میں فارسی سے عربی زبان میں منتقل ہوا، وہ بھی اس وجہ سے کہ دفتر خراج کے میر منشی نے جو آتش پرست تھا اور جس کا نام فرخ زاد تھا، مغرورانہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ عربی زبان اس قابل نہیں کہ حساب کے تمام جزئیات کو ادا کر سکے۔

رفتہ رفتہ جب تمدن نے زیادہ ترقی کی اور ملکی اور فوجی صیغے میں فی الجملہ امتیاز ہوا تو ذمیوں کو ملکی صیغے میں بار ہونے لگا۔ سب سے پہلے اس کی ابتداء امیر معاویہؓ کے عہد میں ہوئی۔ یعنی ابن آثال ایک عیسائی حمص کا فنانشل کمشنر اور وہاں کا حاکم مقرر ہوا (۱) رفتہ رفتہ کوئی بڑے سے بڑا منصب اور عہدہ ایسا نہیں رہا جو غیر مذہب والوں کے دسترس سے باہر رہا ہو۔ مذہبی صیغہ کو چھوڑ کر دربار میں سب سے بڑے عہدے دو تھے۔ وزارت اور کتابت، کتابت آج کل کی اصطلاح میں چیف سکریٹری

(۱) تاریخ یعقوبی ذکر حکومت معاویہؓ ج ۲ ص ۲۰۰

کے عہدے کے برابر تھی یعنی ہر قسم کے فرامین سلطنت اور سلطنت غیر سے مراسلت کا کام اس سے متعلق ہوتا تھا اور اسی وجہ سے وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ میں جہاں اس عہدے کا ذکر کیا ہے لکھا ہے کہ "ان صاحب ھذہ الخطۃ لابد ان یتخیر من ارفع طبقات الناس" [۱]

غرض یہ دونوں منصب جو اعلیٰ ترین مناصب تھے، ذمیوں کو عطا کئے گئے، عبدالملک بن مروان جو سلطنت بنو امیہ کا دوسرا تاجدار تھا، اس کا کاتب ابن سرجون ایک عیسائی تھا۔

دولت عباسیہ کے عہد میں ابو اسحاق صابی جو اس منصب پر ممتاز تھا بڑے رتبے کا شخص گذرا ہے اور ابن خلکان وغیرہ نے اس کے فضل و کمال کی بڑی تعریف کی ہے، سلطنت دیلم کا سرتاج عضد الدولہ جو شہنشاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا، اس کا وزیر اعظم ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام خلفاء و سلاطین دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ مذہبی شان بھی رکھتے تھے، یورپ کو اس قسم کی بے تعصبی اور فیاضی تک پہنچنے کے لئے ابھی کئی سو برس درکار ہیں۔

ایک امر لحاظ کے قابل یہ ہے کہ اسلامی حکومتوں میں سول اور ملٹری ڈیپارٹمنٹ کسی زمانے میں صاف صاف الگ نہیں ہوئے، اس واسطے جس حد تک کسی محکمہ میں مذہبی حیثیت کا لگاؤ رہتا تھا، ذمی اس سے کم مستحق ہوتے تھے، لیکن اس کے سوا اور ہر قسم کے مناصب اور عہدے تمام ذمیوں کے لئے کھلے تھے اور ہر زمانے میں سینکڑوں اور ہزاروں عیسائی، یہودی، ہندو، آتش پرست سرکاری خدمتوں پر مامور رہے، ہندوستان میں ایک خاص تغیر ہوا یعنی یہ کہ ہندوؤں نے کثرت سے فوجی خدمتیں قبول کیں اور فوج میں بہت بڑا حصہ ان کا تھا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندوؤں نے ہر قسم کے بڑے بڑے ملکی عہدے حاصل قائم کئے، ناواقف ہندو خیال کرتے ہیں کہ یہ فیاضی صرف اکبر

(۱) مقدمہ ابن خلدون، دیوان الرسائل، کتابت، صفحہ ۲۰۰

کے ساتھ مخصوص تھی اور یہ اس کی مادری حیثیت کا اثر تھا، لیکن یہ ان کی تاریخی جہالت کا نتیجہ ہے۔ جہانگیر، شاہ جہاں، یہاں تک کہ عالمگیر جس کو نہایت متعصب خیال کیا جاتا ہے، سب نے ہندوؤں کو بڑے بڑے عہدے دیئے۔ شاہ جہاں کے دربار میں سب سے بڑا منصب نہ ہزاری تھا، یعنی وہ ارکان سلطنت جن کو نو ہزار سواروں کے رکھنے کی اجازت تھی، اس سے اتر کر ہفت ہزاری اور اس عہدے پر مہابت خان خان خاناں ممتاز تھا، اس کے نیچے پنج ہزاری و چار ہزاری وغیرہ تھے۔ چنانچہ اس درجہ کے مناصب پر مسلمانوں اور ہندوؤں کی تعداد قریب برابر تھی۔ ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہاں اس قسم کے ہندو عہدہ داروں کی فہرست لکھتے ہیں، جس کو ہم شاہ جہاں کی سرکاری تاریخ شاہ جہاں نامہ سے انتخاب کیا ہے۔

رانا جگت سنگھ	پنج ہزاری	راجہ بیٹھل داس	چہار ہزاری
گج سنگھ	"	بھارت بندیلہ	"
جے سنگھ	"	راؤ سور	"
راؤ رتن ہاڑا	"	جگدیو رائے	"
جھجھار سنگھ	"	ہمیر رائے	"
بالوجی دکنی	"		
اوداجی رام	"		
بہادر جی	"		

ان کے علاوہ گیارہ ہندو افسر دو ہزاری، بارہ ڈیڑھ ہزاری، سولہ ایک ہزاری، آٹھ نہ صدی، گیارہ ہشت صدی، آٹھ ہفت صدی تھے اور ان سے نیچے کے عہدہ دار تو بے شمار تھے۔

ان تمام واقعات کے ثابت ہونے کے بعد دنیا خود اس کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں نے غیر قوموں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟

الجزیہ

غیر مذہب والوں نے ہمیشہ اس لفظ کو نہایت ناگواری سے سنا ہے، ان کا خیال ہے کہ اسلام اس لفظ کا موجد ہے، اسلام ہی نے یہ اصول پیدا کیا جس سے اس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مذہب والوں میں نہایت متعصبانہ اور نامناسب تفرقہ قائم کرنا تھا، ان کا خیال ہے کہ جزیہ ایک ایسا جبر تھا جس سے بچنے کے لئے اسلام قبول کر لینا بھی گوارا کیا جاتا تھا اور اس وجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنے کا ایک قوی ذریعہ تھا، لیکن یہ تمام غلط خیالات انہیں غلط فہمیوں سے پیدا ہوئے ہیں، جو غیر قوموں کو اسلام کی نسبت ہیں، ہم اس موقع پر تین حیثیتوں سے جزیہ پر بحث کرنی چاہتے ہیں، جزیہ اصل میں کس زبان کا لفظ ہے اور کن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے، ایران اور عرب میں جزیہ کی بنیاد کب سے قائم ہوئی، اسلام نے اس کو کس مقصد سے اختیار کیا۔

پہلی بحث

جزیہ گو اب مصطلح معنی میں خاص ہو گیا ہے۔ لیکن لغت کی رو سے وہ خراج اور جزیہ کے لئے یکساں موضوع ہے، قاموس میں ہے، "الجزیة خراج الارض وما یوخذ من الذمی" جوہری و صاحب قاموس نے اس لفظ کے اصل اشتقاق سے کچھ بحث نہیں کی، صاحب کشاف نے اس کو "جزی" سے مشتق خیال کیا ہے، اصل یہ ہے کہ غیر زبانوں کے جو الفاظ عربی میں مستعمل ہو گئے ہیں، ان کی نسبت ہمارے مصنفین اکثر غلطی کرتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ خاص اس قسم کے الفاظ نہایت استیعاب سے جمع کئے گئے ہیں اور یہ فن لغت کی ایک شاخ بن گئی ہے، تاہم جو

تیسری بحث

اسلام نے جو انتظام قائم کیا، اس کی رو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کے لئے مجبور کیا جا سکتا تھا۔ یہ قاعدہ کچھ آسان قاعدہ نہ تھا اور لوگ اگر ذرا بھی اس سے بچنے کا حیلہ پا جاتے تھے تو اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، چنانچہ ایک بار جب جزیرہ سسلی کے مکتب کے معلم اس جبر سے بری کر دیئے گئے تو سینکڑوں آدمیوں نے اور کام چھوڑ کر یہی پیشہ اختیار کر لیا۔ (۱)

اس لحاظ سے کل مسلمان فوجی خدمت رکھتے تھے اور ضرور تھا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہیں، جس طرح نوشیرواں عادل نے کل اہل فوج کو اس (جزیہ) سے بری رکھا تھا۔ لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات کے لئے راضی ہو سکتے تھے، اس لئے ضرور تھا کہ وہ اپنی حفاظت کے لئے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا، جو فارسی لغت سے معرب کیا گیا تھا، لیکن اگر کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لئے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیہ سے بری کر دیئے گئے۔ جیسا کہ ہم آئندہ تاریخی شہادت سے ثابت کریں گے۔

جزیہ کا معاوضۂ حفاظت ہونا۔ علمی و عملی طور سے ہمیشہ مسلم رہا اور یہی سبب ہے کہ اسی خیال نے اکثر اہل لغت کو اس طرف متوجہ ہونے دیا کہ جزیہ فارسی زبان کا لفظ ہے، وہ سمجھے کہ یہ لفظ جزاء سے نکلا ہے، جس کے معنی بدلے کے ہیں اور چونکہ یہ بھی ایک معاوضہ اور بدلہ ہے لہٰذا اس مناسبت سے اس کا نام جزیہ رکھا گیا۔

(۱) دیکھو معجم البلدان یاقوت حموی ذکر صقلیہ ج ۵ ص ۳۹۶

فارس سے گزشتہ ہوئی تو حذیفہ بن محصن نے کہا "او الجزاء و نمنعکم ان احتجتم
الی ذلک" یعنی یا جزیہ دو اور اس صورت میں جب تم کو ضرورت ہوگی تو ہم
تمہاری حفاظت کریں گے، یہ معاہدے اور تحریریں صرف زبانی باتیں نہ تھیں بلکہ
ہمیشہ اس پر عمل کیا گیا۔

ابو عبیدہؓ جراح نے شام میں جب متواتر فتوحات حاصل کیں تو ہرقل نے
ایک عظیم الشان فوج مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لیے تیار کی، مسلمانوں کو اس کے
مقابلے میں بڑی مستعدی سے بڑھنا پڑا اور ان کی تمام قوت و توجہ فوجوں کی ترتیب میں
مصروف ہوئی، اس وقت حضرت ابو عبیدہؓ امین افسر فوج نے اپنے تمام عاملوں کو جو
شام کے مفتوحہ شہروں پر مامور تھے لکھ بھیجا کہ جس قدر جزیہ و خراج جہاں جہاں
وصول کیا گیا ہے سب ان لوگوں کو واپس دے دو جن سے وصول ہوا تھا اور ان سے
کہہ دو کہ ہم نے تم سے جو کچھ لیا تھا اس شرط پر لیا تھا کہ تمہارے دشمنوں سے تمہاری
حفاظت کر سکیں، لیکن اب اس واقعہ کے پیش آجانے کی وجہ سے ہم تمہاری حفاظت کا
ذمہ نہیں اٹھا سکتے" ابو عبیدہؓ کے خاص الفاظ جن میں عیسائیوں سے خطاب ہے، یہ ہیں،
"انما رددنا علیکم اموالکم لانه قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع وانکم
قد اشترطتم علینا ان نمنعکم وانا لا نقدر علی ذلک وقد رددنا علیکم
ما اخذنا منکم" عیسائیوں نے مسلمانوں کو دل سے دعا دی اور کہا کہ خدا پھر تم
کو ہمارے شہروں کی حکومت دے، رومی ہوتے تو اس موقع پر واپس دینا تو درکنار
جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ بھی لے لیتے، چنانچہ سب سے پہلے اس حکم کی تعمیل حمص میں
ہوئی جہاں حضرت ابو عبیدہؓ خود مقیم تھے، انھوں نے حبیب بن مسلمہ کو بلا کر کہا کہ جو
کچھ ذمیوں سے وصول ہوا ہے سب ان کو واپس کردو، اس کے بعد ابو عبیدہؓ دمشق میں
آئے اور سوید بن کلثوم کو اس کام پر مقرر کیا کہ ذمیوں سے جس قدر رقم وصول ہوئی
ہے سب ان کو واپس کر دی جائے۔ [1]

[1] دیکھو کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص ۸۱ و فتوح البلدان ص ۱۳۷ و فتوح الشام ازدی ص ۱۳۷

ان سب باتوں سے زیادہ یہ امر اس دعویٰ کے لئے دلیل بیّن ہے کہ اگر کسی غیر قوم نے فوجی خدمت پر رضامندی ظاہر کی تو اسی طرح جزیہ سے بری رہے۔ جس طرح خود مسلمان۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جب حبیب بن مسلمہ نے قوم جراجمہ (۱) پر فتح پائی تو ان لوگوں نے فوجی خدمتوں میں بوقت ضرورت شریک ہونا خود پسند کیا اور اس وجہ سے وہ تمام قوم جزیہ سے بری رہی۔ نہ صرف جراجمہ بلکہ بہت سے نبطیوں اور ان کے متصل کی آبادیوں نے یہ امر اختیار کیا اور جزیہ سے بری رہیں۔ خلیفہ واثق باللہ عباسی کے زمانے میں وہاں کے عامل نے غلطی سے ان لوگوں پر جزیہ لگایا تو انہوں نے خلیفہ کو اطلاع دی اور دربار خلافت سے ان کی براءت کا حکم صادر ہوا۔ (۲) جزیہ کا معاوضۂ حفاظت ہونا اس قدر صاف صاف ظاہر کر دیا گیا تھا کہ معاہدوں میں یہاں تک کہ تصریح کر دی جاتی تھی کہ ذمی اگر صرف ایک سال فوجی خدمت میں شریک ہوں گے تو اس سال کا جزیہ چھوڑ دیا جائے گا۔ چنانچہ خود حضرت عمرؓ کے زمانے میں کثرت سے یہ معاملہ پیش آیا۔ عتبہ بن فرقد نے جب آذربائیجان فتح کیا تو معاہدے میں یہ الفاظ لکھے "علی ان یؤدوا الجزیة علی قدر طاقتهم ومن حشر منهم فی سنة وضع عنه جزاء تلک السنة" یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ جزیہ ادا کریں اور جو شخص کسی سال لڑائی میں بلایا جائے گا تو اس سال کا جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب آرمینیہ کے بعض حصے فتح ہوئے تو سپہ سالار نے معاہدے میں یہ الفاظ لکھے۔ "ان ینفروا لکل غارة وینفذوا لکل امر ناب اولم ینب راه الوالی صلاحا علی ان توضع الجزاء عمن اجاب الی ذلک ومن استغنی عنه منهم وقعد فعلیه مثل ما علی اهل اذربائیجان من الجزاء" (۳) یعنی

---

(۱) ایک عیسائی قوم تھی اور شہر جراجمہ اور اس کے مضافات میں آباد تھی۔ معجم البلدان میں اس مقام کا ذکر تفصیلاً لکھا ہے ج ۲ ص ۸۰ (۲) فتوح البلدان بلاذری ص ۱۶۱ و ۱۶۲ (۳) تاریخ طبری ج ۵ ص ۲۶۶۵

صلح اس شرط پر ہوئی کہ یہ لوگ جب لڑائی پیش آئے یا کوئی ضرورت پیش ہو تو مسلمانوں کے ساتھ شریک ہوں۔ اس صورت میں ان پر جزیہ نہیں لگایا جائے گا۔ لیکن جس شخص کی ضرورت ہو اور وہ بیٹھ رہے تو اس کو آذربائیجان والوں کی طرح جزیہ ادا کرنا ہوگا۔ اسی معاہدے میں یہ لفظ بھی ہے اور وہ صاف صاف ہمارے دعوی کی توضیح ہے "والحشر عوض من جزائهم" یعنی لڑائی میں ذمیوں کا شریک ہونا جزیے کا قائم مقام ہے (۱) خود حضرت عمرؓ نے متعدد دفعہ یہ احکام بھیجے تھے کہ اگر کسی ذمی سے اتفاقیہ کسی موقع پر مدد لو تو اس سال کا جزیہ چھوڑ دو۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جرجان وغیرہ ممالک میں جو معاہدہ ہوا، اس میں یہ الفاظ تھے: "ومن استعنا به منكم فله جزاءه في معونته عوضا عن جزاءه" (۲) یعنی ہم اگر کسی ذمی سے اعانت لیں گے تو اس اعانت کے بدلے میں جزیہ چھوڑ دیا جائے گا۔

معاہدات میں یہ تصریح کہ جزیہ کے عوض میں ہم تمہاری اندرونی و بیرونی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ جب حفاظت پر قدرت نہ ہو تو جزیہ کا واپس کر دینا۔ جو قومیں فوجی خدمت پر آمادہ ہوں ان کو جزیہ سے بری رکھنا۔ کیا ان واقعات کے ثابت ہونے کے بعد بھی شبہ رہ سکتا ہے کہ جزیہ کا مقصد وہی تھا، جو ہم نے تیسری بحث کے آغاز میں بتایا ہے۔

جزیہ کے مصارف یہ تھے۔ لشکر کی آراستگی، سرحد کی حفاظت، قلعوں کی تعمیر۔ ان سے بچا تو سڑکوں اور پلوں کی تیاری۔ سررشتہ تعلیم۔ بے شبہ اس طرح اس خاص رقم سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا اور پہنچنا چاہیے تھا۔ مسلمان لڑائیوں میں شریک ہوتے، جانیں لڑاتے، ملک کو تمام خطروں سے بچاتے تھے۔ پس جس طرح ان کے جسم و جان سے ذمی رعایا مستفید ہوتی تھی، اگر ذمیوں کے مال سے مسلمانوں کو بھی فائدہ پہنچتا تھا تو کیا بے جا تھا۔ اس کے علاوہ صدقہ کی رقم جو خاص مسلمانوں سے وصول کی جاتی تھی اس میں ذمی رعایا برابر کی شریک تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال

(۱) تاریخ کبیر طبری ج ۵ ص ۲۶۶۵ (۲) ایضاً ص ۲۶۵۸

کے داروغہ کو لکھا بھیجا تھا کہ خدا کے اس قول میں انما الصدقات للفقراء والمساکین (صدقات فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں) مسکینوں سے عیسائی اور یہودی مراد ہیں۔ [1]

جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۱۲ روپے سالانہ تھی۔ کسی کے پاس لاکھوں روپے ہوں تو اس سے زیادہ دینا نہیں پڑتا تھا۔ عام شرح چھ روپے اور تین روپے سالانہ تھی۔ بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے اور عورتیں، مفلوج، معطل الاعضاء، نابینا، مجنون، مفلس یعنی جس کے پاس دو سو درہم سے کم ہوں یہ لوگ عموماً جزیہ سے معاف تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی۔ جس کے ادا کرنے سے فوجی پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے، جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے؟ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہئے۔ جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے، ان کو اسلام نے جس قدر حقوق دیئے کون حکومت اس سے زیادہ دے سکتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے مضمون کے عنوان سے یہ بحث کسی قدر دور پڑ جاتی ہے، اس لئے اس موقع پر ہم یہ بحث چھیڑنی نہیں چاہتے۔

(۱) کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۷۰

اختلاف اور مسامحت

آج کل قوم کے تنزل اور ادبار کے مسئلہ پر جب بحث کی جاتی ہے تو تنزل کا سب سے بڑا سبب جو قرار دیا جاتا ہے وہ آپس کا اختلاف ہے۔ ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ مسلمانوں میں اس سرے سے اس سرے تک یہ تمام مرض پھیلا ہوا ہے۔ شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، وہابی، بدعتی، معتزلہ، حالی (نیچری) بیسیوں فرقے ہیں، پھر ان میں الگ الگ جتھے جن میں سے ہر ایک دوسرے کو گمراہ اور بے دین کہتا ہے۔ ارباب بریلی، دیوبند، ندوہ سب حنفی ہیں، لیکن بریلی والوں کے نزدیک دیوبند اور ندوہ دونوں کافر، اس تفرق، اس اختلاف، اس بد گمانی کے ساتھ کوئی قوم کیونکر زندہ رہ سکتی ہے؟ یہ حالت پیش آئے تو ایک گروہ کا گرنا کچھ بھی وجہ تعجب نہیں۔ چونکہ اس خیال کا اثر ایک بہت بڑے قومی اور تاریخی مسئلہ پر پڑتا ہے، اس لئے ہم اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہیں۔

اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے امور ذیل کا فیصلہ کرنا چاہئے۔

۱۔ کیا زمانہ سلف میں اختلاف تھا؟

۲۔ اختلاف کے ساتھ اتحاد ممکن ہے؟ یا نہیں؟

پہلے امر کے لئے ہم کو اس زمانہ پر نظر ڈالنی چاہئے، جب آفتاب اسلام کی دوپہر تھی، جب ایک طرف تیغ دستان نے اسپین اور سندھ کے ڈانڈے ملا دیئے تھے اور دوسری طرف عربی قلم نے مصر و یونان کے تختہ علوم و فنون کو جھکا دیا تھا، اس وقت قدری، جبری، معتزلی، جہمی وغیرہ وغیرہ اس قدر بے شمار فرقے تھے کہ بہ مشکل ان کو ۷۲ کے عدد میں محصور کیا گیا۔ ان فرقوں میں جو اختلاف تھا اس کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دوسرے کو کافر بلکہ کافر سے بدتر کہتا تھا اور گمراہ و مرتد و زندیق کہنا تو معمولی بات تھی۔

معتزلہ قرآن مجید کو مخلوق اور حادث کہتے تھے، اس مسئلہ کی نسبت محدثین اہل سنت کے یہ اقوال ہیں جو امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات میں نقل کئے ہیں۔

وکیع بن جراح۔

من زعم ان القرآن محدث فقد کفر	جس کا یہ خیال ہے کہ قرآن مخلوق ہے وہ کافر ہے۔

یزید بن ہارون۔

من زعم ان کلام اللّٰہ مخلوق فھو واللّٰہ الذی لا الہ الا ھو زندیق	جو یہ کہتا ہے کہ کلام الٰہی مخلوق ہے، خدائے یکتا کی قسم وہ زندیق ہے۔

امام بخاری۔

نظرت فی کلام الیہود والنصاری والمجوس فما رایت قوما اضل فی کفرھم من الجہمیۃ (۱)	میں نے یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں سب کا کلام دیکھا ہے، کوئی کفر میں اس قدر گمراہ نہیں جس قدر جہمیہ۔

اشعری، ماتریدی، حنبلی، محدثین، سب اہل سنت وجماعت ہیں اور سب ایک دوسرے کو برسر حق سمجھتے ہیں، تاہم جب ان میں سے ایک اپنے عقائد کا ذکر دوسرے کے مقابلہ میں کرتا ہے تو اس کا نام اس طریقہ سے لیتا ہے۔ تمہید (۲) ابو شکور سالمی حنفیوں کی علم عقائد کی مشہور و مستند کتاب ہے، اس میں لکھا ہے۔

قال بعضھم بانا نعرف اللّٰہ تعالیٰ بالرسول وھو قول الاشعری و قال اھل السنۃ والجماعۃ انا نعرف الرسول باللّٰہ تعالیٰ (۳)	بعض کہتے ہیں کہ ہم خدا کو رسول کے ذریعہ سے جانتے ہیں اور یہی اشعری کا قول ہے اور اہل سنت والجماعت کا یہ قول ہے کہ ہم رسول کو خدا کے ذریعہ سے جانتے ہیں۔

امام بزدوی نے علم کلام میں جو کتاب لکھی ہے اور جس کا قلمی نسخہ ہمارے

---

(۱) کتاب مذکور ص ۲۰۹ ۔ ۱۹۲۴ مطبوعہ الہ آباد (۲) کتاب حنفیوں کی علم کلام کی مشہور اور مستند کتاب ہے (۳) تمہید ص ۸۰ مطبع غریب دہلی ۱۳۰۹ھ

پیش نظر ہے اس میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔

علامہ ذہبی مشہور محدث ہیں اور فن حدیث میں ان کے بعد کوئی ان کا ہمسر نہیں پیدا ہوا۔ ان کی نسبت علامہ ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں۔

هذا شيخنا الذهبي له علم وديانة وعنده على اهل السنة تحمل مفرط فلا يجوز ان يعتمد عليه وهو شيخنا ومعلمنا غير ان الحق احق بالاتباع (۱)	یہ ہمارے استاذ ذہبی عالم ہیں۔ متدین ہیں، با ایں ہمہ اہل سنت سے نہایت تعصب برتتے ہیں۔ اس لئے ان پر اعتماد نہیں ہوسکتا اور وہ ہمارے شیخ اور معلم ہیں۔ لیکن حق بات پیروی کئے جانے کی زیادہ مستحق ہے۔

علامہ ابن عبد البر جو مشہور محدث گذرے ہیں اور جن کی شرح موطا نے امام مالک پر شروح موطا میں سب سے بہتر ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب جامع بیان العلم میں جو [illegible]ھ میں قاہرہ میں چھاپی گئی ہے۔ ایک خاص باب باندھا ہے۔ اس کا اقتباس ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں۔

فعن مغيرة عن حماد انه ذكر اهل الحجاز فقال مالقيهم فلم يكن عندهم شئی والله لصبيانكم اعلم منهم بل صبيان صبيانكم (۲)	مغیرہ سے مروی ہے اور مغیرہ حماد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اہل حجاز کا تذکرہ کیا تو کہا کہ میں نے ان لوگوں سے ملاقات کئے تو انکے پاس کچھ نہ تھا خدا کی قسم تمہارے بچے ان سے زیادہ علم رکھتے ہیں بلکہ تمہارے بچوں کے بچے ہیں۔
وعن الزهری قال مارايت قوما انقض لعری الاسلام من اهل مكة ..... (۳)	زہری سے مروی ہے کہ میں نے کسی قوم کو اہل مکہ سے زیادہ شیرازۂ اسلام کو منتشر کرنے والا نہیں دیکھا۔
وهذا ابن الشهاب (اى الزهری)	.... ابن شہاب زہری نے اپنے زمانہ

(۱) الرفع والتکمیل مصنفہ مولانا عبد الحئی لکھنوی ص ۲۰ (۲) مختصر جامع بیان العلم باب حکم قول العلماء بعضهم فی بعض ص ۱۹۵ (۳) ایضاً ص ۱۹۶

قد اطلق علی اهل مکة فی زمانه انهم ینتقصون عری الاسلام ما استثنی منهم احدا وفیهم من جلة العلماء من لا خفاء بجلالته فی الدین واظن ذلک والله اعلم لما روی عنهم فی الصرف ومتعة النساء ...... (١)

کے عام اہل مکہ کے متعلق کہا کہ وہ اسلام کے شیرازہ کو منتشر کرتے ہیں۔ زہری نے ان میں کسی کو مستثنیٰ نہ کیا۔ حالانکہ ان میں بڑے بڑے علماء موجود تھے۔ جن کی دینی عظمت و جلالت مسلم تھی۔ میں گمان کرتا ہوں کہ زہری نے یہ اس لئے کہا کہ اہل مکہ سے مسئلہ صرف اور متعہ مروی ہے۔

وروی علی بن مسهر عن هشام بن عروة عن ابیه قال قالت عائشة ما علم انس بن مالک وابو سعید الخدری بحدیث رسول الله صلی الله علیه وسلم وانما کانا غلامین صغیرین ... (٢)

علی بن مسہر نے ہشام بن عروہ سے روایت کی اور ہشام اپنے باپ سے راوی ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ انس بن مالک اور ابو سعید خدری نے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں جانا، وہ دونوں چھوٹے بچے تھے ....

وعن ابن وهب قال مالک وذکر عنده اهل العراق فقال انزلوهم منزلة اهل الکتاب لا تصدقوا ولا تکذبوهم (٣)

اور ابن وہب سے مروی ہے کہ امام مالک کے سامنے اہل عراق کا تذکرہ ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ اہل عراق کو اہل کتاب کی طرح سمجھو نہ ان کی تصدیق کرو نہ تکذیب۔

اختلاف کے ساتھ اتحاد

اوپر کی روایتوں سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ عین ترقی اسلام کے زمانہ میں مختلف عقائد کی کیا حالت تھی لیکن اس وقت لوگ اس نکتہ کو سمجھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اختلاف کے ساتھ بھی مشترک اغراض میں اتحاد ممکن ہے۔

اس نکتہ کی تعلیم خود قرآن مجید نے کی ہے۔

(١) مختصر جامع بیان العلم ۔ باب حکم قول العلماء بعضهم فی بعض ۔ ص ١٩٦

(٢) ایضاً ص ١٩٧ (٣) ایضاً ص ١٩٩

وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا (لقمان ۳۱:۱۵)

اگر وہ دونوں (ماں باپ) یہ کوشش کریں کہ تو ہمارا شریک اس چیز کو بنائے، جس کا تجھ کو علم نہیں تو تو ان کا کہنا نہ مان، لیکن دنیا میں ان سے اچھی طرح پیش آ۔

اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ مثلاً ایک شخص مسلمان ہے اور اس کے ماں باپ مشرک اور کافر ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کو بھی مشرک اور کافر بنا لیں، اس حالت میں خدا حکم دیتا ہے کہ کفر اور شرک میں ان کا کہنا نہیں تسلیم کرنا چاہئے، لیکن اس سے ان کے حقوق پورے زائل نہیں ہو جاتے، اس لئے دنیوی معاملات میں ان کا ادب و لحاظ اسی طرح ملحوظ رکھنا چاہئے جو عموماً والدین کا حق ہے۔

اس آیت نے بتا دیا کہ اختلاف اور اتفاق کے حدود الگ الگ ہیں، یہ ممکن ہے کہ مذہب کے معاملہ میں اختلاف ہو اور دوسرے معاملات میں اتحادی اصول پر عمل کیا جائے گا۔

قرون اولیٰ میں اسی اصول پر عمل رہا، مثالیں ہم ذیل میں لکھتے ہیں جن سے یہ مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے گا۔

اوپر گذر چکا کہ محدثین، قدریہ، جبریہ، معتزلہ، شیعہ وغیرہ کو اہل بدعت اور اہل اہوا سمجھتے تھے، ان کو گمراہ اور ...... سمجھتے تھے، باایں ہمہ دین کا نہایت اہم کام یعنی حدیث کی روایت کرنا ان سے جائز سمجھتے تھے، فن حدیث کا یہ مسئلہ ہے کہ فرقہائے باطلہ سے حدیث روایت کرنا جائز ہے یا نہیں، یعنی مثلاً اگر ایک حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو جس کے سلسلہ روایت میں معتزلی یا شیعہ وغیرہ ہوں تو یہ حدیث معتبر ہوگی یا نہیں، اس مسئلہ کے متعلق اکثر ائمہ حدیث کا یہی فتویٰ ہے کہ ان میں سے خطابیہ کے سوا جن کے مذہب میں جھوٹ بولنا جائز ہے، باقی اور فرقوں سے روایت کرنا جائز ہے، فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث میں ابن حبان کا قول نقل کیا ہے

ليس بين اهل الحديث من اصحابنا خلاف في ان الصدوق المتقن اذا كانت فيه بدعة ولم يكن يدعوا اليها ان الاحتجاج باخباره جائز (۱)

ہمارے ائمہ میں سے محدثین کے نزدیک اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر راست گو صاحب حافظہ بدعتی ہو، لیکن اپنی بدعت کی طرف لوگوں کو بلاتا نہیں تو اس کی روایات سے دلیل لانا جائز ہے۔

اسی کتاب میں حاکم ضیا پوری کی تاریخ نیشاپور سے نقل کیا ہے۔

ان كتاب مسلم ملآن من الشيعة (۲)

امام مسلم کی کتاب شیعی رواۃ سے بھری ہوئی ہے۔

علامہ ابن الصلاح کا قول ہے۔

فان كتبهم طافحة بالرواية عن المبتدعة غير الدعاة (۳)

محدثین کی تصنیفات غیر داعی بدعتیوں کی روایت سے پر ہیں۔

ابراہیم بن یحییٰ امام شافعی کے استاد تھے۔ ان کا مذہب قدری تھا، اس لئے جب امام شافعی ان سے روایت کرتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ مجھ سے ایسے شخص نے روایت کی جس کا دین مشکوک ہے، لیکن روایت صحیح کرتا ہے۔ خطیب بغدادی اس قول کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ان هذا مذهب ابن ابی ليلى وسفيان الثوري ونحوه عن ابی حنيفه بل حكاه الحاكم في المدخل عن كثر ائمة الحديث (۴)

یہ ابن ابی لیلیٰ اور سفیان ثوری کا مذہب ہے اور اسی کے مثل ابو حنیفہ سے مروی ہے، بلکہ یہی مذہب حاکم نے مدخل میں اکثر ائمہ حدیث کا نقل کیا ہے۔

امام شافعی کتاب الام میں لکھتے ہیں۔

فلم نعلم من سلف الايمة

ہم گزشتہ ائمہ میں سے جن کی اقتدا کی جاتی ہے

---

(۱) کتاب مذکور ص ۱۳۰ قلمی نسخہ (۲) ایضاً ص ۲۴۳ (۳) ایضاً (۴) الفیۃ الحدیث ص ۱۰

شخص کے عقائد اچھے ہوں لیکن کاذب الروایات ہو۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کے عقائد خراب ہوں لیکن وہ دروغ گو نہ ہو۔ محدثین کی یہ انتہائی نکتہ سنجی، حقیقت شناسی اور بے تعصبی ہے کہ وہ عقیدہ کے لحاظ سے ایک شخص کو بدعقیدہ، بدعتی، گمراہ سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے تجربہ نے ثابت کردیا ہے کہ وہ شخص جھوٹ نہیں بولتا تو ہم سے بے تکلف حدیث سیکھتے ہیں، روایت کرتے ہیں، اس کی شاگردی کا اعتراف کرتے ہیں۔

قتادہ ایک مشہور محدث گذرے ہیں، ان کی نسبت علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں لکھا ہے۔

ما کان قتادہ یرضی حتی یصیح به صیاحا یعنی القدر قال ابن عروبه والله ستوائی قال قتادہ کل شئی بقدر الا المعاصی، فقت مع هذا الاعتقاد الردی ما تاخر احد عن الاحتجاج بحدیثه الله بامعه (۱)

قتادہ کو قدر کو زور شور کے ساتھ چلا کے کہے بغیر چین نہیں آتا تھا ابن ابی عروبہ اور دستوائی کہتے ہیں کہ قتادہ کا قول تھا ہر چیز کی تقدیر ہو چکی ہے، لیکن گناہ۔ میں کہتا ہوں کہ اس اعتقاد فاسد کے باوجود کوئی ان کی حدیث کے ساتھ حجت لانے سے باز نہ رہا، خدا ان کو معاف کرے۔

۲۔ اسی اصول کا یہ نتیجہ تھا کہ نصاب تعلیم میں مخالف فرقہ کے لوگوں کی مذہبی کتابیں بھی داخل تھیں، ہر شخص جانتا ہے کہ زمخشری معتزلی تھا اور اس نے قرآن شریف کی جو تفسیر کشاف کے نام سے لکھی، اس میں اپنے عقائد کہیں صریحاً اور کہیں اشارۃً داخل کئے تاہم یہ کتاب ابتدا سے آج تک ہمارے علماء کے درس اور مطالعہ میں رہی۔ علماء کو یقین تھا کہ ادب، عربیت۔ معانی و بلاغت کے لحاظ سے یہ کتاب لاجواب ہے، اس لئے اس کی عام خوبی سے انکار نہیں کرسکتے تھے، البتہ جہاں جہاں زمخشری نے اپنے عقائد کا اظہار کیا ہے، وہاں تنبیہ کردیتے تھے کہ یہ معتزلہ کے عقائد ہیں۔

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۱۱۰ مطبوعہ حیدرآباد

۳۔ عقلی اور ادبی علوم میں اختلاف عقائد کا مطلق اثر نہ تھا، علوم عقلیہ میں جو لوگ امام فن مانے جاتے ہیں قریباً کل آج کل کے نقطۂ نظر سے خارج از مذہب اور کم از کم فاسد العقیدہ تھے، فارابی اور بو علی سینا افلاک کو قدیم مانتے تھے، محقق طوسی غالی شیعہ تھے، چنانچہ تجرید میں خلفائے راشدینؓ کے مطاعن نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، فن بلاغت کے تمام ارکان یعنی جاحظ، عبد القاہر جرجانی، سکاکی، معتزلی تھے، نحو کا سب سے اعلیٰ درجہ کا مصنف رضی شیعہ ہے، فنون ریاضیہ یعنی اقلیدس اور حساب کا تمام تر مدار محقق طوسی کی تصنیفات پر ہے، بایں ہمہ تمام علماء نے اہل سنت و جماعت انہیں کتابوں کو پڑھتے پڑھاتے اور انہیں کو پیشوا و مرجع قرار دیتے آئے اور ان کے مصنفوں کے نام کے بجائے ان کو شیخ، محقق، معلم ثانی، امام کے لقب سے یاد کرتے ہیں، مولانا جامی کا مشہور شعر ہے۔

جامی اگر بتقلید چشمی زرہ دوا — شیخ عبد القادر جرجانی پیر ما

۴۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اہل سنت و جماعت مخالفین مذہب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز سمجھتے تھے اور پڑھتے تھے گو بعض لوگوں نے اس کی مخالفت بھی کی، لیکن عام فتویٰ یہی رہا کہ سب کے پیچھے نماز جائز ہے۔

امام نووی جو مشہور محدث تھے انہوں نے لکھا ہے۔

ولم یزل السلف والخلف علی الصلوۃ خلف المعتزلۃ وغیرھم[1]	اور سلف و خلف کا اسی پر عمل اور اتفاق رہا کہ معتزلہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔

عبد العلی بحر العلوم ارکان اربعہ میں لکھتے ہیں۔

واما انہ لا یجوز الصلوۃ خلف منکر الشفاعۃ لاھل الکبائر ومنکر الرؤیۃ وعذاب القبر ومنکر کرام الکاتبین لانہ کافر	باقی یہ امر کہ جو شخص شفاعت کبائر اور رؤیت اور عذاب قبر اور کراماً کاتبین کا منکر ہو اس کے پیچھے اس وجہ سے نماز ناجائز ہے کہ وہ اسلام سے خارج ہے تو ثابت نہیں، اس سے اس کا

(۱) فتح المغیث ص ۲۳

لتوارث هذه الامور من الشارع ولا يصلي خلف منكر المسح على الخفين والمشبهة وامثالها من تشويشات المتاخرين مخالفة لما عليه القدماء من الائمة المجتهدين فلا يلتفت اليها فضلا عن ان يفتى بها (۱)

منکر کا فرض ہے نہ یہ امر کہ مسح خفین کا جو منکر ہو اس کے پیچھے اور مشتبہ کے پیچھے نماز نہ جائز ہے تو یہ اور اس قسم کی باتیں متاخرین کی تشویشات میں سے ہیں اور ائمہ مجتہدین کے خلاف ہیں، ان کی طرف التفات بھی نہیں کیا جا سکتا چہ جائے کہ ان پر فتویٰ دیا جائے۔

(۱) بحر العلوم ص ۱۹۵ و ۱۹۶ مطبع سیون کلکتہ